تجوری کا راز

تجوری کا راز

جاسوسی دنیا سیریز نمبر ۴

ابنِ صفی

۱۹۵۲

پیش رس

جاسوسی دنیا کا چوتھا ناول آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہاہے۔ اب یہ آپ کے لیے کوئی نئی چیز نہیں رہ گئی ہے۔ ہندو پاکستان کا تقریباً ہر اردو پڑھنے والا جاسوسی دنیا سے روشناس ہو چکاہے اور ہر ایک کو اس کا اعتراف ہے کہ فی زمانہ دنیا کی کوئی زبان اتنا دلچسپ لٹریچر اتنی کم قیمت پر پیش نہیں کر رہی ہے۔ آپ اس ناول کو پلاٹ اور تکنیک کے اعتبار سے سابقہ ناولوں سے کہیں زیادہ دلچسپ پائیں گے، محیّر العقول واقعات دل دہلا دینے والے مناظر، جرأت و ہمّت سے لبریز کارنامے، سارجنٹ حمید کی دلچسپ حرکتیں اور آپ کے ہر دلعزیز انسپکٹر فریدی

کا عجیب و غریب رول، آپ کے پسندیدہ جاسوس آپ کو عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ ایک بار کتاب اٹھانے کے بعد اختتام پر پہنچے بغیر کتاب ہاتھ سے نہیں رکھ سکتے۔ اس ناول میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے اس میں کوئی خون نہیں ہوا پھر بھی ایسے واقعات سے لبریز ہے کہ دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ بہرحال ناول آپ کے سامنے ہے آپ خود فیصلہ کیجئے کہ میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔

ابن صفی

حیرت انگیز ڈاکہ

تقریباً رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ سارے شہر میں خاموشی طاری تھی۔ بازار میں اِکا دُکا پان کی دُکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ شاید پان والوں کو ان گاہکوں کا انتظار تھا جو سیکنڈ شو دیکھ کر لوٹتے وقت پان خریدا کرتے ہیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ ٹرک سنّاٹے کا سینہ چیرتا سنسان سڑکوں پر دوڑتا نظر آجاتا تھا۔ سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔ سردی ہی کی وجہ سے شہر اتنی جلدی سنّاٹے سے ہم آغوش ہو گیا تھا ورنہ گرمیوں میں عموماً شاہراہوں پر تقریباً رات بھر آمد و رفت رہتی تھی مگر اس وقت یہ عالم تھا کہ شہر کے مشہور سیٹھ اگروال کی کوٹھی شہر کے سب

سے بارونق روڈ پر واقع ہونے کے باوجود بھی پُراسرار آدمیوں کو اپنے اندر داخل ہونے سے نہ روک سکی۔

یہ دونوں ایک چھوٹی سی خوبصورت کار میں بیٹھ کر آئے تھے جسے وہ سڑک کے دوسرے کنارے پر چھوڑ کر کوٹھی کی دیوار سے آ لگے تھے۔ اس دیوار کے قریب بہت زیادہ اندھیرا تھا۔ ان دونوں نے چونکہ سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اس لیے وہ اس تاریکی میں اس طرح گُم ہو گئے تھے جیسے دودھ میں پانی۔ ان میں ایک زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور دوسرا اس کے کاندھے پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد بیٹھا ہوا آدمی آہستہ آہستہ سے اُٹھنے لگا۔ اوپر والے نے بارہ تیرہ فٹ اُونچے روشن دان میں ہاتھ ڈال کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسرے لمحہ میں وہ روشن دان کے اوپر تھا۔ اس نے روشن دان کا شیشہ اٹھا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں نیلے رنگ کی دھندلی روشنی والا بلب روشن تھا۔ شاید اس شخص کی قسمت یاور تھی کہ اسے ٹھیک روشن دان کے نیچے لگی ہوئی ایک اونچی میز مل گئی، وہ آہستگی سے اس کے اوپر اُتر گیا۔

اب باہر ایک آدمی رہ گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا صدر دروازے کے قریب پہنچا۔ صدر دروازے پر ایک بلب روشن تھا یہاں اس کی روشنی میں اس کا چھپنا محال تھا۔ لہٰذا وہ بیچ سڑک پر آکھڑا ہوا۔ اس نے اپنے چیسٹر کے کالر کانوں سے اُونچے کر رکھے تھے اور فلٹ ہیٹ چہرے پر اس طرح جھکی ہوتی تھی کہ اس کے خدوخال تاریکی میں چھپ کر رہ گئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازے میں ذرا سی درز ہوئی اور باہر کھڑا ہوا آدمی اِدھر اُدھر دیکھ کر تیزی سے چلتا ہوا صدر دروازے کے قریب آیا۔ صدر دروازہ کھلا اور وہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے کوٹھی کے اندر تھا۔

دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے تاریکی میں چھپتے چھپاتے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے چاروں طرف تاریکی پھیلی تھی۔ ایک جگہ انہیں اوپر کی منزل میں کسی کمرے کے دروازے کے دھندلے شیشیوں میں روشنی دکھائی دی۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں انہوں نے ٹارچ روشن کی۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا جس میں بے شمار صوفے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر قد

آدم تصویریں تھیں اور فرش پر قیمتی قالین، اوپر جانے کے لیے ایک طرف سنگِ مرمر کے زینے تھے۔ ہال میں سنّاٹا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ زینوں پر چڑھنے لگے، انہوں نے اس کمرے میں جھانک کر دیکھا جس کے دروازوں کے شیشوں سے روشنی چھن رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھُلا ہوا تھا ان میں سے ایک نے دروازے کو آہستہ سے کھولا۔ سیٹھ اگروال دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ یہ دونوں اتنی آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئے کہ سیٹھ اگروال کو خبر تک نہ ہوئی۔

"سیٹھ جی۔۔۔!" ایک نے آہستہ سے کہا۔

سیٹھ اگروال چونک کر مڑا۔۔۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ ہلائے ہی تھے کہ ایک نے ریوالور نکال لیا۔

"منہ سے آواز نہ نکلے۔۔۔!" ریوالور والے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

سیٹھ اگروال کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا لیکن وہ جی کڑا کر کے بولا۔

”تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔“

”ڈرو نہیں۔۔۔ اگر خاموشی سے بیٹھے رہے تو ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے۔“ دوسرے نے کہا۔

”تم لوگوں نے یہاں آ کر غلطی کی۔۔۔!“ سیٹھ اگروال نے کہا۔ ”یہاں تمہیں کچھ زیادہ نہ مل سکے گا۔ میں سب کچھ بینک میں رکھتا ہوں۔“

دونوں ہنسنے لگے۔

”ہم معمولی چور یا ڈاکو نہیں۔۔۔!“ دوسرے آدمی بولا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کی طرف مڑ کر کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔“

وہ ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھا۔

”اُدھر کہاں جاتے ہو۔۔۔“ اگروال نے کہا۔ ”وہ میرے سونے کا کمرہ ہے۔“

”اور وہیں تم نے اپنی تجوری رکھ چھوڑی ہے۔“ دوسرے نے کہا۔

"لیکن اس کی کنجی نیچے ہے۔" اگروال بولا۔

"مجھے کنجی نہیں چاہیے۔۔۔!" دوسرے نے کہا اور دروازہ کھول کر کمرے میں چلا گیا۔

ایک آدمی ریوالور لیے ہوئے بدستور سیٹھ اگروال کے پاس کھڑا رہا۔

سیٹھ اگروال نے کئی بار اسے دھوکہ دے کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار پستول کی نال اس کی کنپٹی سے ٹکرائی۔

"دیکھو سیٹھ صاحب! اگر تم نے زیادہ گڑبڑ کی تو تمہیں یہیں ختم کر دیا جائے گا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ محض دھمکی ہے۔ یہ ریوالور بغیر آواز کا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی، اور ہم تمہیں مار کر چلتے بنیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم لوگ خواہ مخواہ جھک مار رہے ہو۔" سیٹھ اگروال نے کہا۔

"تجوری میں دو تین ہزار سے زیادہ تمہیں نہ مل سکے گا۔"

”خیر۔۔۔ یہ ہمارا اپنا سودا ہے، تمہیں اس سے کیا۔“

سیٹھ اگروال خاموش ہو گیا لیکن اس کی آنکھیں اپنے سونے کے کمرے کے دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ گھنٹہ گھر کی گھڑی نے بارہ بجائے۔ دوسرا آدمی ابھی تک اگروال کے سونے کے کمرے ہی میں تھا۔ سڑک پر سیکنڈ شو دیکھ کر لوٹنے والوں کی آمدورفت شروع ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسرا آدمی کمرے سے نکل آیا۔

”کہیے استاد کیا رہا۔“ پہلا آدمی بولا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔!“ دوسرے نے کہا۔ ”لاؤ پستول اب مجھے دو اور تم سیٹھ جی کو کرسی سے باندھ دو اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔ تا کہ یہ ہمارے جاتے ہی شور نہ مچانا شروع کر دیں۔

پہلے آدمی نے دوسرے کے ہاتھ میں پستول دے دیا۔ اور خود ریشم کی پتلی ڈور سے سیٹھ اگروال کو کرسی میں جکڑنے لگا۔

"میرے منہ میں کپڑا مت ٹھونسو میں وعدہ کرتا ہوں کہ نہیں چیخوں گا۔" سیٹھ اگروال نے کہا۔

"سیٹھ جی۔۔۔ اگر تم اتنے ہی ایماندار ہوتے تو ہمیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔" دوسرے آدمی نے کہا۔

پہلے آدمی نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔

دونوں ابھی ہال میں پہنچے ہی تھے کہ بچاؤ بچاؤ، دوڑو دوڑو کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ شاید اگروال نے کسی طرح اپنے منہ سے کپڑا نکال لیا تھا اور اب وہ بے تحاشہ چیخ رہا تھا۔ دفعتاً اندھیرے میں دو تین آدمی دوڑتے ہوئے معلوم ہوئے۔

"شاید سیٹھ جی کے کمرے سے آواز آرہی ہے۔" ایک آواز سنائی دی۔

"ہاں چلو اوپر چلیں۔۔۔!" دوسری آواز آئی اور زینہ پر قدموں کی آہٹ معلوم ہونے لگیں۔

"استاد اب کیا کیا جائے۔" ایک نے کہا۔

”چلو جلدی کرو۔۔۔ صدر دروازہ کی طرف۔“

”مگر شاید باہر بھی آدمی جمع ہو گئے ہیں۔“

”ڈرو نہیں۔۔۔ آگے بڑھو۔۔۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔“ دونوں تیزی سے صدر دروازہ پر پہنچے جو اندر سے بند تھا۔ باہر بھی شور سنائی دے رہا تھا۔

”شاید لوگ دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں"

استاد نے دروازہ پر پہنچ کر چیخنا شروع کر دیا۔

”ہائے مار ڈالا۔۔۔ مار ڈالا۔۔۔ بچاؤ۔۔۔ بچاؤ۔۔۔!“

لوگ باہر سے دروازہ پیٹنے لگے۔

اُستاد نے چیختے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ اب پہلے آدمی نے بھی اپنے استاد کی تقلید شروع کر دی تھی اور وہ بھی چیخ رہا تھا۔

لوگ ”کیا ہے۔۔۔ کیا ہے۔“ کہتے ہوئے اندر گھُسنے لگے اور یہ دونوں بچاؤ بچاؤ

چیختے ہوئے باہر نکل گئے۔

سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر دونوں کار میں بیٹھ گئے۔

"ارے وہ کار میں بیٹھ گئے۔۔۔ پکڑو۔۔۔ پکڑو۔۔۔ وہی تو ہیں۔۔۔!" سیٹھ اگروال اوپر کی کھڑکی سے سر نکالے چیخ رہا تھا۔

جیسے ہی لوگ کار کی طرف جھپٹے استاد نے نوٹوں کا بنڈل کھول کر مجمع پر پھینک دیا۔ فضا میں سینکڑوں نوٹ اُڑ رہے تھے۔ مجمع بے تحاشہ نوٹوں کی طرف جھک پڑا اور کار جو اب اسٹارٹ ہو چکی تھی یہ جا وہ جا۔ نظروں سے غائب ہو گئی۔

نئ الجھنیں

دوسرے دِن صُبح سارجنٹ حمید اور انسپکٹر فریدی سیر کے لئے جانے کی تیّاری کر رہے تھے نوکر نے سب انسپکٹر جگدیش کا ملاقاتی کارڈ لا کر دیا۔

"مجھے افسوس ہے انسپکٹر صاحب کہ میں ناوقت مخل ہوا۔" جگدیش نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"آؤ۔۔۔ آؤ بھئی کوئی بات نہیں۔" فریدی نے مُسکرا کر کہا۔

"خیریت تو ہے آپ کچھ بدحواس سے نظر آرہے ہیں۔" حمید نے کہا۔

”خیریت کہاں حمید بھائی۔۔۔!“ جگدیش نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب کی مہربانی سے میرے افسر مجھے بہت زیادہ سمجھنے لگے ہیں اور یہ چیز میرے لیے وبال جان بن گئی ہے۔“

فریدی ہنسنے لگا۔

”آخر کہو تو کیا بات ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا عرض کروں۔۔۔ رات ایک عجیب و غریب واردات ہو گئی۔ جس کی تفتیش میرے ذمہ ڈالی گئی ہے اور میں جو کچھ ہوں میں ہی بہتر جانتا ہوں۔ ابھی مجھ میں اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے کہ کسی معمولی چوری کا سُراغ لگا سکوں۔“

”خیر۔۔۔ چلو آگے چلو۔“

”کل رات سیٹھ اگروال کے یہاں دو آدمی گھُس آئے اُن میں سے ایک سیٹھ اگروال کے سر پر پستول تانے کھڑا رہا اور دوسرا ان کے سونے کے کمرے میں گھُس گیا جہاں تجوری رکھی ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے واپس آ گیا۔

دونوں نے اگروال کو کرسی میں جکڑ کر ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ اگروال نے منہ سے کسی طرح کپڑا نکال لیا اور چیخنے لگا۔ اس وقت ساڑھے بارہ بجے ہوں گے سیکنڈ شو ختم ہوئے تھے اس لیے سڑک پر بھی کافی آمدورفت ہو گئی تھی۔ اگروال کے چیخنے پر ایک طرف تو ان کے گھر والے بیدار ہو گئے اور دوسری طرف سڑک پر ان کے صدر دروازے پر کافی بھیڑ لگ گئی۔ دونوں آدمیوں نے جب یہ دیکھا تو وہ بھی چور، چور چِلّاتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگے۔ اسی حالت میں انہوں نے صدر دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے۔ باہر نکلتے وقت انہوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ ارے مار ڈالا، ارے مار ڈالا۔۔۔ لوگ سمجھے کہ شاید وہ بھی اسی کوٹھی کے رہنے والے ہیں لیکن اگروال کے چلّانے پر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور وہ بدمعاشوں کی موٹر کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ان دونوں نے دو تین ہزار روپوں کے نوٹ مجمع کی طرف پھینک دیے۔ لوگ نوٹوں کی طرف پلٹے اور وہ دونوں کار اسٹارٹ کر کے چلتے بنے۔"

”بھئی بہت خوب۔۔۔!“ فریدی بے تحاشہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”وہ چاہے جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن میں ان کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا بھئی کمال کر دیا۔“

”یہی نہیں اور سنیے۔۔۔!“ جگدیش نے کہا۔ ”اِدھر وہ لوگ فرار ہوئے اور اُدھر کسی نے پیچھے سے اگروال پر پستول سے حملہ کر دیا۔ فائر گھر کے اندر سے ہوا تھا، گولی داہنے بازو کو چھید گئی۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہڈّی پر کوئی ضرب نہیں آئی وہ اس وقت ہسپتال میں ہیں۔“

”تو یہ فائر ان دونوں کے فرار ہو جانے کے بعد ہوا تھا۔“

”جی ہاں۔۔۔!“

”اچھا تجوری تو بالکل صاف ہو گئی ہو گی سیٹھ صاحب کی۔“

”یہی تو تعجّب کی بات ہے کہ ان لوگوں نے تجوری کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”سیٹھ اگروال کا بیان ہے کہ تجوری کی ساری چیزیں جوں کی توں موجود ہیں اور کمرے سے کوئی اور چیز بھی چوری نہیں ہوئی۔“

”تب تو یہ کیس واقعی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔“

”بہت دلچسپ۔۔۔!“ جگدیش نے کہا۔

”خیر بھئی اب تو چائے کا وقت بھی ہو گیا۔“ فریدی نے کہا۔ ”حمید چائے منگواؤ۔۔۔ تو پھر تم نے کیا کیا۔“ فریدی نے جگدیش سے پوچھا۔

”کرنا ہی کیا۔۔۔ مجھے آتا ہی کیا ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں پر رُعب ڈالنے کے لیے آتشی شیشہ سے مجرم کی انگلیوں کے نشانات تلاش کرتا رہا۔ دو چار الٹے سیدھے سوالات سیٹھ صاحب کے گھر والوں سے کیے۔ خود سیٹھ کا بیان لیا اور بس۔“

”خیر کوئی پریشانی کی بات نہیں۔۔۔ کام کرنے ہی سے آتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ تو میں بھی سمجھتا ہوں۔۔۔ مگر!“

"اوہ۔۔۔ مگر کیا۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" فریدی نے کہا۔ "لو چائے پیو۔۔۔ شاید تم رات بھر جاگے ہو۔ ناشتہ کر کے یہیں سو رہو اور اب تو تم اپنے حلقہ کے آفیسر انچارج ہو۔ تمہیں اتنی محنت نہیں کرنی چاہیئے۔ اتنی جلدی ڈی ایس پی یا ایس پی بننے کے خواب نہ دیکھو۔

"اگر آپ اسی طرح مُجھ پر مہربان رہے تو اس دِن کو بھی دور نہیں سمجھتا۔" جگدیش نے کہا۔

"جگدیش صاحب۔۔۔ آپ خواہ مخواہ غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں۔" حمید نے کہا۔ "جو شخص خود آج تک چیف انسپکٹر نہ ہو سکا وہ کیا کسی کو ترقّی دِلا سکے گا۔"

"شاید تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ آج تک سارجنٹ ہی رہے۔" فریدی مُسکرا کر بولا۔

"میں آپ کے اس خیال کی تردید نہیں کر سکتا۔۔۔!" حمید نے جواب دیا۔

"حمید تم آج انسپکٹر ہو سکتے ہو لیکن یہ سمجھ لو کہ پھر ہم تم ایک جگہ نہ رہ سکیں

گے۔" فریدی نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ تمہیں انسپکٹری عزیز ہے یا فریدی۔"

"اب میں کیا عرض کروں۔۔۔ خود ہی سمجھ لیجئے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں حد درجہ چاپلوس واقع ہوا ہوں۔"

فریدی اور جگدیش ہنسنے لگے۔

"اچھا تو پھر انسپکٹر بنوا ہی دیا جائے۔"

"نہیں معاف رکھیئے۔ رات میں جو تین چار گھنٹے سو لیتا ہوں اس سے بھی جاؤں۔۔۔ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے۔"

یہاں آتے وقت جگدیش راستہ بھر یہ سوچتا آیا تھا کہ فریدی ایسا عجیب و غریب کیس سُن کر اُچھل پڑے گا۔ واردات کے متعلّق سوالات کی بوچھاڑ کر دے گا۔ کُچھ دیر تک ناک بھوں پر زور دے گا اور پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگے گا۔ لیکن ان سب باتوں کے خلاف اس وقت فریدی کا رویّہ دیکھ کر اُسے سخت حیرت ہوئی۔ اصل موضوع کو چھوڑ کر وہ نہ جانے کہاں کے بکھیڑے نکال بیٹھا تھا اور اب حمید اور

فریدی میں بالکل نجی قسم کی باتیں چھڑ گئی تھیں۔ فریدی اسے چڑا رہا تھا اور وہ جھلّا جھلّا کر جواب دے رہا تھا۔ جگدیش نے پھر اصل موضوع کی طرف آنے کی کوشش کی۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" جگدیش نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔ "آخر مجرم آئے کس نیّت سے تھے۔ کیا انہوں نے محض اس لیے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا کہ مکان میں صرف ٹہل کر واپس چلے جائیں۔"

"اتنی معمولی سی بات بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔" حمید نے کہا۔ "مقصد اصل میں سیٹھ اگروال کو قتل کرنا تھا، مجرم یقیناً دو سے زیادہ رہے ہوں گے۔ دو نے بھاگ دوڑ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور تیسرے نے سیٹھ پر گولی چلائی اور اسی ہنگامہ میں وہ بھی نکل بھاگا۔"

فریدی مُسکرانے لگا۔

"کیا بچپنے کی باتیں کر رہے ہو۔" فریدی نے سگار کا کش لے کر کہا۔ "اگر قتل ہی

کرنا تھا تو اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت تھی۔ ان دونوں نے جس طرح خاموشی سے سیٹھ اگروال کو کرسی میں باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا اسی طرح اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار بھی سکتے تھے۔ وہ لوگ جو اتنی ذہانت کا ثبوت دے کر نکل بھاگے ہوں اتنے لغو پلاٹ نہیں بنا سکتے۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" جگدیش جلدی سے بولا۔

"اصل میں جو چیز زیادہ حیرت انگیز ہے وہ یہ کہ اتنے چالاک آدمیوں نے سیٹھ کو اتنی بد احتیاطی کے ساتھ کیوں بے بس کیا کہ وہ انکے پیٹھ پھیرتے ہی آزاد ہو کر چیخنے لگا۔ جو لوگ اتنے ذہین ہوں کہ تعاقب کرنے والوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے ان پر نوٹ برسا دیں ایسی حماقت نہیں کر سکتے۔"

"واقعی یہ بات بھی سوچنے والی ہے۔" جگدیش نے کہا۔

"یہاں کون سی ایسی بات ہے جو سوچنے والی نہیں ہے۔" حمید بولا۔

"ہاں یہ تو بتاؤ۔" فریدی نے جگدیش سے کہا۔ "مجرموں نے جو نوٹ پھینکے تھے

ان میں سے کوئی نوٹ تمہیں بھی دستیاب ہو۔"

"جی ہاں۔۔۔ ایک سو روپے کا نوٹ!" جگدیش نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ نوٹ ایک پان والے کو ملا تھا جس کی دُکان سیٹھ اگروال کی کوٹھی کے قریب ہی ہے۔"

فریدی نوٹ لے کر دیکھتا رہا۔

"اس پر امپیریل بینک کی مہر پڑی ہوئی ہے۔" فریدی بولا۔

"میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ اس نوٹ کو لے کر امپیریل بینک جاؤں۔" جگدیش نے کہا۔

"بہت ممکن ہے کہ یہ اب سے ایک سال قبل وہاں سے ایشو کیا گیا ہو۔ اس طرح پتہ چلنا محال ہے۔"

"پھر آخر بتایئے کہ میں کیا کروں۔" جگدیش نے کہا۔

"دھیرج دھیرج۔۔۔!" فریدی نے ہنس کر بولا۔ "آخر اتنی جلدی کیوں ہے۔ اس سے بھی معمولی قسم کی وارداتوں میں مہینوں خاک چھاننی پڑتی ہے۔ تم ایک ہی دِن میں تاج محل کیوں تعمیر کر ڈالنا چاہتے ہو۔"

"اچھاتو صاحب۔۔۔ اب میں جا کر سوتا ہوں۔ یہ کیس میرے بس کا روگ نہیں اور میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اپنی نااہلی کا ثبوت دوں، اگر آپ نے مجھے حلقہ کا آفیسر انچارج بنوا کر اس جنجال میں پھنسوایا ہے تو آپ ہی اسے بھی سنبھالیے۔"

"بھئی میں تمہاری مدد کے لیے ہر وقت تیّار ہوں۔۔۔!" فریدی نے کہا۔ "لیکن اس کی کیا صورت ہو گی۔ رام سنگھ والے کیس کی اور بات تھی معاملہ کسی نہ کسی طرح نبھ ہی گیا۔ یہاں دشواریاں پیش آ سکتی ہیں اور پھر اگر کسی طرح بھانڈا پھوٹ گیا تو تمہاری بڑی بھد ہو گی۔ ویسے میں تمہیں ہر قسم کے مشورے دینے کے لیے تیّار ہوں۔"

"خیر کچھ سہی۔۔۔ آپ کی مدد کے بغیر یہ گاڑی چلتی نظر نہیں آتی۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکا کہ تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ مگر اس سلسلہ میں کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتا جس سے تمہاری اس شہرت کو دھکا لگے جو تم نے رام سنگھ والے کیس میں حاصل کی ہے۔"

"اچھا تو پھر اب میں چلوں۔" جگدیش نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ذرا اس نوٹ کا نمبر تو مجھے لکھوا دو۔" فریدی نے الماری پر سے نوٹ بُک اٹھاتے ہوئے کہا۔ جگدیش نے نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نمبر لکھ کر فریدی نے وہ نوٹ اسے پھر یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ تم بینک مت جانا، ورنہ خواہ مخواہ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے کام خراب کر دو گے۔ جگدیش کے چلے جانے کے بعد وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"کہیے کیا خیال ہے۔" حمید نے مُسکرا کر کہا۔

فریدی بھی بے اختیار مُسکرا پڑا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر گولی کس نے چلائی۔" فریدی نے کہا۔

”یہی تو سوچنے کی بات ہے۔“حمید بولا۔”لیکن آخر یہ آپ کو سوجھی کیا تھی۔“

”ہر بات اگر تمہاری سمجھ میں آنے لگے تو بات ہی کیا رہ گئی۔“فریدی نے کہا۔

”آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر پکڑ لیے گئے تو کیا حشر ہو گا۔“

”برخوردار دو ہزار روپے کا خون اس لیے نہیں کیا تھا کہ پکڑ لیے جائیں۔“

مگر عین وقت پر آپ کو سوجھی خوب۔۔۔ میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

”عین وقت پر نہیں سوجھی۔۔۔ میں اس کے لیے پہلے ہی تیّار ہو کر گیا تھا۔ ورنہ یونہی خواہ مخواہ دو ہزار کے بنڈل جیب میں لیے پھرنے کی کیا تک ہے۔“

”بہر حال خدا کا شکر ہے کہ بخیر و خوبی نکل آئے۔“حمید نے کہا۔

”اور یہ سارا ہلڑ محض تمہاری وجہ سے ہوا، میں نے تو تم سے اسے باندھنے کے لیے کہہ کر سخت غلطی کی تھی، یہ کام مجھے ہی کرنا چاہیے تھا۔ ورنہ وہ کیا اس کا باپ بھی آواز نہیں نکال سکتا تھا۔“

”اس کا باپ تو واقعی آواز نہ نکالتا۔ لیکن خُدارا یہ بتائیے کہ آخر آپ نے یہ سب کس لیے کیا تھا۔“

”ابھی نہیں۔۔۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ اگروال پر گولی کس نے چلائی تھی، میں کچھ نہ بتاؤں گا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے میں اس وقت تک اختلاج میں مبتلا رہوں۔“ حمید نے کہا۔

”نہیں، تم اس دوران میں خمیرہ مروارید اور عرق مشک استعمال کر سکتے ہو۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”اچھا یہی بتا دیجئے کہ آپ نے اس تجوری سے کیا چیز نکالی تھی جس کا اسے بھی علم نہیں۔“

”کمال کیا تم نے، اسے علم کیوں نہیں۔۔۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ لیکن بتانے کی ہمّت نہیں کر سکتا۔“

”چلیے اب تو آپ نے اور بھی اُلجھا دیا۔“حمید نے کہا۔”آخر آپ مجھ سے یہ راز کیوں چھپا رہے ہیں جبکہ میں آپ کا شریک کار بھی ہوں۔“

”اب دراصل یہ ہے کہ اگر میں تمہیں بتا دوں تو اس معاملہ میں تمہاری ساری دلچسپی ختم ہو جائے گی اور تم اچھی طرح کام نہ کر سکو گے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی دلچسپی ختم نہ ہونے دوں گا۔“حمید نے کہا۔

”دلچسپی، لینا یا نہ لینا اپنے بس کی بات نہیں۔ جتنی زیادہ جو چیز ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے اتنا ہی ہم اسے بے نقاب کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں اور اس کے ظاہر ہو جانے کے بعد خود بخود ہماری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔“

”بہر حال تو آپ نہیں بتائیں گے۔“حمید نے بے دلی سے کہا۔

”ارادہ تو یہی ہے اور ساتھ ہی یہ اُمّید بھی ہے کہ تم بُرا نہ مانو گے۔“

”اس پر غور کروں گا کہ بُرا مانوں یا نہ مانوں۔۔۔!“حمید نے کہا۔”اچھا یہی بتا دیجئے کہ آخر آپ نے جگدیش سے نوٹ کا نمبر کیوں لیا ہے۔“

”ہاں یہ بتا سکتا ہوں، مجھ سے ایک بڑی حماقت ہوئی۔ وہ یہ کہ میں نے ان بنڈلوں میں کچھ سو روپے کے نوٹ بھی رہنے دیے تھے حالانکہ مجھے یہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بینک سے سو روپے کے نوٹ نمبر لکھے بغیر ایشو نہیں کیے جاتے۔ اگر جگدیش نے اس کے متعلّق چھان بین شروع کر دی ہوتی تو بڑی مشکل آ پڑتی۔ میں نے پرسوں ہی بینک سے یہ روپے منگوائے تھے۔ مجھے اُمّید ہے کہ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وہ خود بینک نہ جائے گا۔“

”اگر یہی بات تھی تو پھر آپ نے وہ نوٹ اسے واپس کیوں کر دیا۔“

”گھبراؤ نہیں۔۔۔ وہ پھر میرے پاس واپس آ جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔

”وہ کیسے۔۔۔؟“

”نہایت آسانی سے۔۔۔ میں نے جو پروگرام اس وقت بنایا ہے اس پر عمل کیے بغیر کام نہ چلے گا لیکن اس کے لیے خصوصاً تمہیں ہمّت سے کام لینا پڑے گا۔“

”آپ پھر گول مول باتیں کرنے لگے۔“

”اچھا تو خیر سنو۔۔۔ اب ہمیں متواتر کئی دِنوں تک مختلف مقامات پر اپنی رات والی حرکت دُہرانی پڑے گی۔“

”ارے واہ۔۔۔ ارے۔۔۔ واہ۔۔۔!“

”بس نکل گئی جان۔۔۔!“ فریدی نے کہا۔ ”اس کا ذمّہ میں لیتا ہوں کہ تم پکڑے نہ جاسکو گے۔“

”میں کہتا ہوں آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”بھئی تمہیں اس سے کیا بحث۔۔۔ اگر میرا ساتھ دے سکتے ہو تو خیر، میں زبردستی مجبور نہ کروں گا۔“

”میری جان عجیب مصیبت میں پڑ گئی۔“ حمید بولا۔

”نہیں اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اگر تم انکار کرنا چاہو تو بخوشی کر سکتے ہو۔ مجھے اس کا کوئی ملال نہ ہو گا۔“

”خیر جہاں آپ وہاں میں۔۔۔ لیکن اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ کے بیان کے مطابق جب کل رات آپ کو کامیابی ہو گئی تو پھر اب اِدھر اُدھر ہڑ بونگ مچانے سے آپ کا کیا مقصد ہے۔“

”اب تم نے کی ہے قاعدے کی بات۔۔۔ اچھا سنو۔۔۔ اب یہ چیز ضروری ہو گئی ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ نوٹ جگدیش کے قبضہ سے نکالنا ہی ہے ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ کسی مشکل میں پھنس جائیں۔“

”لیکن اس طرح وہ نوٹ ہمیں کیسے مل سکے گا۔“

”جب ہم لوگ اسی طرح کی دو تین عجیب و غریب وارداتیں اور کر گذریں گے تو یہ کیس خواہ مخواہ سول پولیس کے ہاتھ سے نکل کر ہم تک آئے گا۔ کیا یہ عجیب بات نہ ہو گی کہ وہ ڈاکو بلا مقصد لوگوں کے گھروں میں گھُس گھُس کر تجوریوں کا جائزہ لیتے پھرتے ہیں۔“

”سوچا تو آپ نے خوب ہے۔ لیکن۔۔۔!“

”دیکھو میں صاف بات۔۔۔ لیکن ویکن کا میں قائل نہیں۔ جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں اس کے متعلّق میں نے پہلے ہی سے بہت کچھ سوچ رکھا ہے اور اب تو صرف ہمّت کی بات ہے۔“

”خیر صاحب! جیسا بھی کچھ ہو گا۔ دیکھا جائے گا لیکن اتنا تو آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ شور وغُل ہو جانے کے بعد بھاگ نکلنے والی ترکیب تو اب کام نہ دے گی کیونکہ اس وقت تک اس کی شہرت سارے شہر میں ہو گئی ہو گی۔ اس لیے اب لوگوں کو چکر نہ دیا جاسکے گا۔“

”یہ ضروری نہیں کہ میں وہی پرانی لکیر پیٹتا رہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”اوّل تو اب ہلّڑ ہونے کے امکانات ہی نہ ہونے دوں گا اور اگر اتّفاق سے ایسا ہو بھی گیا تو اسی وقت کوئی اور تدبیر کر لی جائے گی اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ میرا ذہن ہمیشہ خطرات میں پڑنے کے بعد ہی تیزی سے کام شروع کر دیتا ہے۔“

”بھلا اس حقیقت سے کس کافر کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن۔۔۔!“

”پھر وہی لیکن۔۔۔!“ فریدی نے جھلّا کر کہا۔ ”آخر تمہیں لیکن کا خبط کیوں ہو گیا ہے۔ میں تو بار بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ اگر تمہاری ہمّت نہ پڑتی ہو تو صاف انکار کر دو۔ میں اکیلے ہی یہ کام کر لوں گا۔“

”آپ پھر غلط سمجھے ہیں۔ میں بہر حال آپ کے ساتھ ہوں گا چاہے آپ وہ کام غلط کر رہے ہوں یا صحیح۔ کہنا تو صرف اتنا ہے کہ جب قانون کے محافظ ہی قانون شکنی پر آمادہ ہو جائیں تو پھر اوروں کا اللہ ہی مالک ہے۔“

”اس بات کو میں شائد تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔“ فریدی نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ ”لیکن اب تم پر اس کام کی اہمیت ظاہر ہو گی تو تم بھی قانون کے خلاف جرم کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جاؤ گے۔ لیکن میں ابھی تمہیں اس راز سے آگاہ نہیں کر سکتا۔“

شہر کی ہلچل

تین دِن سے شہر کی پولیس بُری طرح پریشان تھی۔ سیٹھ اگروال کے واقعہ کے بعد سے اب تک اسی طرح کی دو اور وارداتیں ہو چکی تھیں، شہر کے، مشہور دولت مندوں کی تجوریاں کھولی جائیں لیکن کوئی چیز غائب نہ ہو اور تجوریوں کو کھولنے والے صاف بچ کر نکل جائیں۔ اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ یہ ساری کی ساری وارداتیں جگدیش کے ہی حلقہ میں ہو رہی تھیں۔ جگدیش کئی بار فریدی سے مل کر اس سے مدد کا خواہاں ہوا۔ مگر ہر بار اس نے دم دلاسہ دے کر رخصت کر دیا۔ آج بھی وہ دیر سے بیٹھا فریدی کا دماغ چاٹ رہا تھا۔

”اب آپ ہی بتایئے کہ میں کیا کروں۔ بڑی بدنامی ہو رہی ہے میری۔“ جگدیش نے کہا۔

”اچھا بھئی تم پریشان کیوں ہوتے ہو۔ آج میرا ارادہ ہے کہ رات میں تمہارے حلقہ کا گشت کروں، مگر یہ بات کسی سے کہنا نہیں۔“

”ارے نہیں صاحب! کبھی زبان پر بھی نہ لاؤں گا۔ آپ کچھ کیجئے تو۔“ جگدیش نے کہا۔ ”تو کیا آپ ہم لوگوں کے ساتھ گشت کیجئے گا۔“

”تم لوگوں کے ساتھ گشت کرنے سے کیا فائدہ۔۔۔ تم لوگوں کا طریقہ اگر کار آمد ہوتا تو اتنے دِنوں تک خاک کیوں چھاننی پڑتی۔ میں تنہا گشت کروں گا۔ میں نے ان بھاگنے والوں کا نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کر لیا ہے۔“

”تو اچھی بات ہے۔ میں اب مطمئن ہو گیا ہوں۔۔۔ ممکن ہے رات میں کہیں آپ سے ملاقات ہو جائے کیونکہ آج کل میں بھی رات بھر مارا مارا پھرتا ہوں۔“ جگدیش نے کہا۔

”بات ہی ایسی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور یہ عجیب بات ہے کہ یہ ساری وارداتیں تمہارے ہی حلقہ میں ہو رہی ہیں۔“

”یہی تو بڑی حیرت کی بات ہے۔“ جگدیش نے کہا۔ ”نہ جانے ان دونوں کو مجھ سے کیوں اتنی پرخاش ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کہیں یہ ہمارے ہی محکمہ کے کسی آدمی کی شرارت نہ ہو۔ کیونکہ میرا اتنا جلد ترقّی کر جانا ہر ایک کو کھٹک رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ انہی میں سے کوئی میری بدنامی کے لیے کوشاں ہو۔“

”تم نے بات تو بہت معقول سوچی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بہت ممکن ہے کہ یہی بات ہو، میں بھی اس چیز کو عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے بعض ساتھی تم سے بُری طرح جلنے لگے ہیں۔“

”جی ہاں یہی تو بات ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا ہاتھ لگنا کچھ دشوار سا معلوم ہو رہا ہے۔“

”فکر مت کرو۔۔۔! ہاتھ تو وہ اس طرح لگیں گے کہ بس دیکھتے ہی رہ جائیں گے مگر اس بار پھر کہے دیتا ہوں کہ راز داری شرط ہے۔“

”ارے آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں کوئی بچّہ تو ہوں نہیں کہ معاملات کو نہیں سمجھتا۔ آپ مطمئن رہئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے گی، اچھا تو اب میں اجازت چاہوں گا۔“ جگدیش کے چلے جانے کے بعد فریدی بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

”خوب بے وقوف بنا رہے ہیں آپ بے چارے کو۔۔۔!“ حمید نے کہا۔

”بے وقوف نہیں بنا رہا ہوں بلکہ میں اُس کے لیے ترقّی کے دروازے کھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”آپ کی باتیں آپ جانیں۔۔۔ یا جانے خدا۔۔۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔“

”اپنی بساط کے مطابق کافی سمجھ لیتے ہو لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرے بعد تم ہی میری جگہ لو گے۔“

"اچھاتواب مجھے بھی گھِسنا شروع کر دیا۔" حمید نے ہنس کر کہا۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو۔" فریدی نے کہا۔ "یہ بتاؤ آج کہاں ہاتھ مارا جائے گا۔"

"اللہ اب پیچھا بھی چھوڑیئے۔"

"پیچھا تو اس وقت تک نہیں چھوٹ سکتا جب تک کہ یہ کیس میرے ہاتھ میں نہ آ جائے۔"

"اس بار شاید ان گدھوں نے بھی قسم کھا رکھی ہے کہ معاملہ ہم تک نہ پہنچنے دیں گے۔" حمید نے کہا۔

"تو کیا کوئی نیا گُل کھلانے کا ارادہ ہے۔"

"یقیناً۔۔۔ اگر دو دِن کے اندر اندر یہ کیس میرے سپرد نہیں ہوتا تو مجبوراً مجھے کلکٹر صاحب کے بنگلہ میں بھی گھُسنا پڑے گا۔"

"اس دِن مجھے معاف ہی رکھیے گا۔" حمید فریدی سے بولا۔

”واہ بیٹا۔۔۔ بڑے اچھے رہے۔ جب امتحان کا وقت آیا تو جان نکل گی۔ تبھی تو دیکھی جائے گی تمہاری بہادری۔“

”لاحول ولا قوۃ۔۔۔!“ حمید نے کہا۔ ”کتنی بار آپ کو یقین دِلا چکا ہوں کہ میں انتہائی بزدل ہوں مگر آپ کچھ سماعت نہیں کرتے۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم مذاق کرتے ہو۔“

”جی نہیں۔۔۔ آپ اس طرح مت جان لیا کیجئے۔ میں انتہائی بزدل واقع ہوا ہوں۔“

”اچھا بکواس بند، آج سیٹھ کرم چند کے یہاں۔۔۔ کیا سمجھے۔“

”مار ڈالا۔۔۔!“ حمید بوکھلا کر بولا۔ ”آج یقیناً پکڑے جائیں گے۔ ارے اس کی کوٹھی تو کوتوالی کے قریب ہی ہے۔“

”ہوگی۔۔۔!“ فریدی نے کہا۔ ”اس سے کیا ہوتا ہے۔“

"اس سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔۔۔ ارے اس سے یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات گولی لگ جانے کا خطرہ ہوتا ہے، پکڑ کر بند کر دیے جانے کا احتمال رہتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔!"

"اچھا اچھا رہنے دیجئے۔۔۔ آج میں اکیلے ہی جاؤں گا۔"

"خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔۔۔!" حمید نے کہا۔

"اچھا تو کیا واقعی آپ اسے سچ سمجھے۔۔۔ برخوردار اس پھیر میں نہ رہنا۔ تم تو کیا تمہاری مکھیاں بھی چلیں گی۔"

"آپ شوق سے میری مکھیوں کو اپنے ہمراہ لے جاسکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ لیکن مجھے معاف ہی کر دیجئے تو زیادہ بہتر ہے۔"

"بہت اچھا۔۔۔ دیکھا جائے گا۔" فریدی نے جھنجھلا کر کہا اور آنکھیں بند کر کے آرام سے کرسی پر لیٹ گیا۔

حمید بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ دفعتاً وہ مُسکرانے لگا اس کے چہرے پر شرارت کے

آثار پیدا ہو گئے تھے۔

"میرے خیال سے تو آج بھی وہیں چلنا چاہیے جہاں کل گئے تھے۔" حمید نے کہا۔

"یہ نیا خیال آپ کے ذہن میں کیسے پیدا ہوا۔" فریدی نے بدستور آنکھیں بند کئے ہوئے کہا۔

"وہ جو وہاں سو رہی تھی۔۔۔ خدا کی قسم۔۔۔" حمید نے کہا۔

"اچھا جی۔۔۔!" فریدی نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیوں۔۔۔ کیا آپ کو پسند نہیں آئی۔"

"تو کیا میں وہاں اسی کو پسند کرنے گیا تھا۔"

"تو اور کیا۔۔۔ اس طرح لوگوں کے گھروں میں گھُستے پھرنے کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔"

"بہت خوب۔۔۔ یہ نئی دریافت ہے کیا کہنا۔" فریدی مُسکرا کر بولا۔

"آپ چاہے جتنا بنائیں مجھے تو اب یقین آ گیا ہے کہ یہ آپ کی کچلی ہوئی جنسی زندگی ہی کی ایجاد ہے۔" حمید نے سنجیدگی سے بولا۔

"دیکھو میاں حمید تم ابھی صاحب زادے ہو۔" فریدی ہنس کر بولا۔ "تم اس طرح کی گفتگو کر کے مُجھ سے میرا راز نہیں اُگلوا سکتے۔۔۔ یہ ساری باتیں تمہیں اس وقت معلوم ہو سکیں گی۔ جب میں چاہوں گا۔"

حمید جھینپ کر خاموش ہو گیا۔

"اور اگر تم اس راز کو معلوم کرنے کے لیے اتنے ہی بے چین ہو تو پھر تمہیں وہی کرنا چاہیے جو میں کہوں۔"

"ارے صاحب تو میں نے انکار کب کیا ہے۔" حمید نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ تم شاید سمجھنے لگے ہو کہ تمہارے بغیر میرا کام نہ چل سکے گا۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔" فریدی نے کہا۔

"لیجئے۔۔۔ آپ تو پھر ناراض ہو گئے۔ میں کب کہتا ہوں کہ میں آپ کا ساتھ نہ

دوں گا۔"

"اچھی بات ہے تو اسی بات پر اب تیّاری شروع کر دو۔ اس وقت پانچ بجے ہیں۔ ٹھیک ایک بجے ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ چھوٹی کار کے نمبر کی پلیٹ بدل دو اور ہاں اس کے اوپر دوسری پالش تو ہو ہی گئی ہو گی۔"

"جی ہاں۔۔۔ ہرے رنگ کی پالش کر دی ہے۔"

"بہت خوب۔۔۔! نوکروں سے تو مدد نہیں لی تھی۔"

"آپ شائد مُجھے نِرا گھامڑ ہی سمجھتے ہیں۔"

"نرا تو نہیں۔۔۔ البتّہ کچھ ضرور سمجھتا ہوں۔" فریدی نے کہا۔ "آؤ ذرا چل کر اسے دیکھ لیں۔"

فریدی اور حمید کمرے سے نکل کر گیراج کی طرف آئے۔ حمید نے گیراج کا تالا کھولا۔ یہ گیراج ہمیشہ بند رہتا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی کار تھی جسے فریدی مخصوص موقعوں پر استعمال کرتا تھا۔ اس کے بہت سے ملنے والوں کو بھی اس کا

عِلم نہیں تھا کہ فریدی کے پاس دو کاریں ہیں۔ ملازمین میں سے صرف ڈرائیور کو اس کا علم تھا لیکن اسے بھی آج تک اس کار کو چلانے کا اتّفاق نہ ہوا تھا۔ شہر میں ہونے والی وارداتوں کے سلسلہ میں آج کل فریدی اور حمید اسی کار کو استعمال کر رہے تھے۔ روزانہ اس کے اوپر ایک نیا رنگ پھیر دیا جایا کرتا تھا۔ یہ خدمت حمید کے سپرد تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اسے اُلٹا سیدھا لیپ پوت کر رکھ دیا کرتا تھا۔

"ارے یہ اس وقت۔۔۔ یہ محترمہ کہاں سے ٹپک پڑیں۔" فریدی نے پھاٹک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

حمید نے بھی پلٹ کر دیکھا، شہناز بیرونی پھاٹک سے اندر آرہی تھی۔

"کیوں کیا آپ کو اس کا آنا گراں گزرتا ہے۔" حمید نے کہا۔

"نہیں بھئی۔ اس وقت کی بات ہے، معلوم نہیں کتنی دیر تک بیٹھے، ساڑھے نو تو ہو ہی چکے ہیں۔" فریدی بولا۔

"خیر شکر ہے کہ آپ لوگ ملے تو۔۔۔!" شہناز قریب آکر بولی۔ "میں کل بھی

آئی تھی۔"

"کیا بتائیں آج کل ہم لوگ بہت بُری طرح مشغول رہتے ہیں۔" فریدی نے کہا۔

"چلو اندر چلو۔"

وہ تینوں ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔

"میں اس لیے آئی ہوں کہ آج سہاگ رات کا آخری دِن ہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" فریدی شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولا۔

شہناز اپنے جملہ کی حماقت پر جھینپ گئی۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ کل پلازا میں دوسری فلم لگ جائے گی۔" شہناز جھینپتے ہوئے انداز میں بولی۔

"اوہ تو یہ کہو کہ تم آج فلم سہاگ رات دیکھنا چاہتی ہو۔" فریدی نے کہا۔

"جی ہاں۔۔۔!"

”تو جاکر دیکھ آؤ، اچھی فلم ہے۔“

”اکیلے دیکھ آؤں، کیا آپ لوگ نہ چلیں گے۔“

”نہیں بھائی۔۔۔ ابھی دو تین دِن تک ہم لوگ بہت زیادہ مشغول رہیں گے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اچھا میں ابھی آتا ہوں۔“

فریدی باہر چلا گیا۔

شہناز اس طرح منہ پھُلائے بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہ حمید سے رُوٹھی ہوئی ہو۔

”کیوں کیا بات، کیا مُجھ سے ناراض ہو۔“ حمید نے کہا۔

”میں کون ہوتی ہوں ناراض ہونے والی، بھلا اپنے محسنوں سے کوئی ناراض بھی ہوتا ہے۔“

”پھر وہی بات، آخر تم مجھے اتنا ستاتی کیوں ہو۔“

”یہ لیجئے۔۔۔ یہ دوسری رہی، میں ہوتی کون ہوں ستانے والی۔“

”آخر میں نے کیا کیا ہے جو اس طرح کی باتیں کر رہی ہو۔“

”میری باتیں اسی طرح بُری لگتی ہیں آپ کو، اچھا لیجئے چلی جاتی ہوں۔“

”ارے بھئی بیٹھو۔۔۔ ارے میں نے کیا کہہ دیا جو اس طرح ناراض ہوتی ہو۔ ارے ارے سنو تو سہی۔“

”نہیں صاحب۔۔۔ میں واقعی بڑی بے حیا ہوں کہ خواہ مخواہ آپ کے پیچھے لگتی ہوں۔“

”خدا کے لیے بتاؤ تو سہی کہ میرا کیا قصور ہے۔ خواہ مخواہ اس طرح سے بگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”میری تو ہر بات اسی طرح خواہ مخواہ کی ہوتی ہے۔“

”دیکھو میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔“

”نہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں، میں انشاء اللہ کبھی آپ سے نہ ملوں گی۔“

”آخر کیوں۔۔۔؟“

”مجھے کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ آپ سے باتیں کر کے آپ کا سر پھوڑ ڈالوں۔“

”خدا کی قسم میں ہار گیا، لو بولتا ہوں۔۔۔ ککڑوں کوں، ککڑوں کوں، ککڑوں۔۔۔!“

”ارے ارے چپ رہیے۔ فریدی صاحب کیا کہیں گے۔“ شہناز گھبرا کر بولی۔

”نہیں صاحب۔۔۔ میں تو بولوں گا۔۔۔ ککڑوں کوں۔۔۔!“

”خدا کے لیے چُپ رہیے۔۔۔ یہ آپ کیا کرنے لگے۔“

”فریدی صاحب پوچھیں گے تو کہہ دوں گا کہ تم اس وقت مجھ سے صرف مرغے کی بولی سُننے کے لیے آئی تھیں۔۔۔ ککڑوں کوں۔۔۔ ککڑوں کوں۔۔۔!“

”خدا کے لیے چُپ رہیے۔۔۔ یہ آپ کیا کرنے لگے۔“

”اچھا وعدہ کرو کہ اب میٹھی میٹھی باتیں کرو گی۔ ورنہ میں یونہی چیخے جاؤں گا۔“

"اچھا بابا۔۔۔ میں ہار گئی لیکن یہ بتایئے کہ آپ دو تین دِن سے آئے کیوں نہیں، آج میرے ساتھ فلم دیکھنے کے لیے کیوں نہیں چلتے۔"

"ہاں یوں بات کرو، بات یہ ہے کہ آج کل ایک خاص مسئلہ درپیش ہے۔ شہر میں جو وارداتیں ہو رہی ہیں ان کے متعلّق تو تم سُن ہی چکی ہو گی، آج کل رات بھر ہم لوگوں کو گشت کرنا پڑتا ہے۔"

"واقعی یہ وارداتیں عجیب ہیں، سارے شہر میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ میں نے تو آج تک اس قسم کی وارداتیں نہیں سُنیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ڈاکو گھروں میں کیوں گھُستے پھرتے ہیں جب کہ وہ وہاں سے کوئی چیز لے کر نہیں جاتے۔"

"یہی تو حیرت کی بات ہے۔۔۔!" حمید پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "اس معاملہ میں فریدی صاحب جیسا مشاق جاسوس بھی حیران ہے۔"

"لوگوں کا خیال ہے کہ ڈاکوؤں کو کسی خاص چیز کی تلاش ہے۔" شہناز بولی۔

"ہم لوگ بھی یہی سوچ رہے ہیں۔" حمید نے کہا۔

”اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ یہ ڈاکو نہ تو کسی پر حملہ کرتے ہیں اور نہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ پکڑ نہ لیے جائیں، سیٹھ اگروال کے یہاں جب وہ گھُسے تھے تو بہت سے نوٹ بانٹ کر چلے گئے، عجیب و غریب لوگ ہیں۔“

”لوگ انہیں بُرا بھلا تو ضرور کہتے ہوں گے۔“ حمید بولا۔

”نہیں یہ بات نہیں۔ لوگ تو ان کی دلیری کی تعریف کرتے ہیں۔“

”یہ بھی عجیب بات ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”اگر کبھی ہم لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے تو ہم بے دریغ گولی چلا دیں گے۔“

”آخر یہ کیوں۔۔۔ انہوں نے کسی کو کوئی نقصان تو پہنچایا نہیں۔“

”یہی کیا کم نقصان ہے کہ آج کل لوگ رات رات بھر سوتے نہیں۔“ فریدی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا ان لوگوں کے متعلّق آپ کا کیا خیال ہے۔“ شہناز نے فریدی سے پوچھا۔

”یہی کہ وہ لوگ پولیس کو اس چکر میں ڈال کر کوئی بڑی واردات کرنا چاہتے ہیں۔“فریدی نے بتایا۔

”آپ کا خیال ٹھیک معلوم ہوتا ہے، بہت سے لوگوں کا یہی خیال ہے۔“ شہناز نے تائید کی۔

”واقعی مجھے افسوس ہے کہ ہم لوگ تمہارے ساتھ فلم دیکھنے نہ جا سکیں گے۔“ فریدی نے قدرے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔”خیر پھر سہی لیکن تم آج جا کر سہاگ رات دیکھ لو۔“

جھاڑیوں میں

رات تاریک تھی۔ فضا میں سیاہیاں اُڑ رہی تھیں۔ وقت کا دیوتا شاید اس وقت کرہ زمہریر سے دنیا کی طرف جھانک رہا تھا۔ سردی ہڈّیوں میں گھستی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید اس وقت سونے والوں کے خواب تک منجمد ہو کر رہ گئے ہوں گے۔

گھنٹہ گھر نے دو بجائے اور سیٹھ کرم چند کے پائیں باغ کے پھاٹک کے سامنے ایک چھوٹی سی ہرے رنگ کی کار آ کر رُکی۔ فریدی اور حمید سیاہ رنگ کے کپڑوں میں ملبوس نقابوں سے اپنے چہرے چھپائے اُتر کر پھاٹک کے اندر داخل ہوئے۔ دفعتاً غرّاہٹ کی آواز سنائی دی اور ایک بڑا سا کتّا ان پر جھپٹ پڑا۔ لیکن دوسرے ہی

لمحہ فریدی کے سائلنسر لگے ہوئے پستول کی دو گولیوں نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔ کتّے کی غرّاہٹ کی وجہ سے شائد کوٹھی کا چوکیدار اونگھتے چونک پڑا تھا۔

"ٹائیگر، ٹائیگر۔۔۔!" اس نے کتے کو آواز دی۔

بھونکنے کی آواز نہ پا کر وہ کھانستا کھنکارتا پھاٹک کی طرف بڑھا۔

"میرے خیال سے اب بھاگنا چاہیے۔" حمید نے کہا۔

"ہشت۔۔۔ میرے پیچھے آؤ۔" فریدی نے آہستہ سے کہا اور مالتی کی گھنی جھاڑیوں میں چھُپ گیا۔ حمید اس کے پیچھے تھا۔ چوکیدار نے ٹارچ روشن کی اور اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔

"ارے یہ ٹائیگر کو کیا ہو گیا۔" وہ خود ہی بڑبڑایا۔ "ارے خون! اِسے کس نے مارا۔" اب وہ شاید کوٹھی کے ملازموں کے نام لے لے کر چیخ رہا تھا۔ پھر وہ چیختا ہوا کوٹھی کی طرف بھاگا۔

"اب بھی غنیمت ہے کہ نکل چلئے، ورنہ بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

حمید نے آہستہ سے کہا۔

"یہی تو بہترین موقع ہے گھر میں داخل ہونے کا۔" فریدی نے کہا۔

"شاید پکڑے ہی جائیں گے۔" حمید بولا۔

"بکو مت۔۔۔!"

اتنے میں تاریک برآمدے کے سارے بلب روشن ہو گئے اور باغ میں کافی اجالا ہو گیا۔ کچھ لوگ دوڑ کر پھاٹک کے قریب آئے اور کتّے کی لاش کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ اب ایک اچھا خاصا شور و غل شروع ہو گیا تھا۔ دفعتاً گشتی پولیس کی لاری پھاٹک کے سامنے آ کر رکی۔

"کیا بات ہے۔۔۔!" لاری سے کسی نے اُونچی آواز میں پوچھا۔

دو تین آدمی دوڑ کر لاری کے قریب گئے اور کچھ کہتے رہے۔

لاری سے آٹھ دس سپاہی اور ایک سب انسپکٹر اتر پڑے۔

سب انسپکٹر پھاٹک میں کھڑے ہو کر سپاہیوں سے بولا۔ "وہ دیکھو وہاں کار کیسی کھڑی ہے۔۔۔ کیا یہ سیٹھ صاحب کی تو نہیں۔"

"جی نہیں سرکار۔۔۔ ہماری سب گاڑیاں گیراج میں ہیں۔"

انسپکٹر نے ٹارچ کی روشنی میں کار کا جائزہ لینا شروع کیا۔ "مگر یہ تو ہرے رنگ کی ہے۔ ڈاکوؤں کی کار سیاہ رنگ کی سنی جاتی ہے۔ رحیم خان تم ذرا جا کر اس کا نمبر تو دیکھو۔"

"یہ جگدیش معلوم ہوتا ہے، بُرے پھنسے۔" حمید نے آہستہ سے کہا۔

"خاموش رہو۔۔۔!" فریدی بولا۔

جگدیش کتّے کی لاش پر جھکا ہوا تھا۔

"ابھی ابھی کسی نے اس پر گولی چلائی ہے۔" جگدیش نے پاس کھڑے ہوئے

آدمیوں کی طرف مڑ کر کہا۔ ’’تعجّب ہے کہ تم لوگوں نے گولی چلنے کی آواز نہیں سُنی۔‘‘

’’نہیں سرکار۔۔۔!‘‘ چوکیدار بولا۔ ’’میں یہیں برآمدے میں بیٹھا جاگ رہا تھا۔ میں نے اس کے غُرّانے کی آواز سُنی تھی لیکن گولی کی آواز مجھے نہیں سنائی گی۔‘‘

’’داروغہ جی۔۔۔ گاڑی کا نمبر وہ معلوم نہیں ہوتا۔۔۔!‘‘ اس آدمی نے لوٹ کر کہا جو کار کا نمبر دیکھنے گیا تھا۔

جگدیش نے کانسٹیبلوں کو باغ کے اندر بلا لیا۔

’’ضرور کوئی نہ کوئی یہیں چھپا ہوا ہے۔ آؤ تلاش کریں اور تم رحیم خان جا کر اس کار کی نگرانی کرو۔‘‘

’’یہ بہت بُرا ہوا۔۔۔!‘‘ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ’’اچھا آؤ۔۔۔ اب چار دیواری کو پھلانگنا کوئی مشکل کام نہیں۔ قبل اس کے کہ رحیم خاں کار تک پہنچے ہمیں اس پر پہنچ جانا چاہیے۔‘‘

چار دیواری مالتی کی باڑ سے بالکل ملی ہوئی تھی اور جھاڑیوں سے نیچی تھی۔ اس لیے وہ دونوں بغیر کسی کی نظر پڑے ہوئے باہر نکل گئے۔ رحیم خاں کار کا دروازہ کھول کر اندر قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ فریدی کا زور دار گھونسہ اس کی بائیں کنپٹی پر پڑا۔ رحیم خاں کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ اُچھل کر سڑک کے کنارے جا گرا۔ دوسرے لمحہ میں کار اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ جگدیش وغیرہ رحیم خاں کی چیخ سُن کر چونکے ہی تھے کہ کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سُنائی دی۔ وہ سب شور مچاتے ہوئے دوڑے مگر کار اتنی دیر میں سینکڑوں گز آگے جا چکی تھی۔

"چلو چلو۔۔۔ جلدی لاری میں بیٹھو۔" جگدیش چیختا ہوا لاری کی طرف جھپٹا۔ بدحواسی میں لوگوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ان کا ایک ساتھی سڑک کے کنارے بے ہوش پڑا ہے۔ پولیس کی لاری کار کا تعاقب کر رہی تھی۔

"دیکھا آپ نے۔۔۔ میں نہ کہتا تھا۔" حمید نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تم تو اچھے خاصے چغد ہو، یہ نہیں دیکھتے کہ مزہ کتنا آیا۔" فریدی نے کہا۔

”گھبرایئے نہیں، ابھی اور آئے گا مزہ۔۔۔ آج خدا ہی عزّت رکھے تو معلوم ہو، پولیس کی لاری برابر پیچھا کیے جارہی ہے۔“

”ڈرو نہیں بیٹا۔۔۔ وہ لوگ ہماری گرد کو بھی نہ پا سکیں گے۔۔۔!“ فریدی نے کہا۔

"دیکھتے نہیں کہ وہ ہم سے کس قدر پیچھے ہیں۔ بس تم رفتار بڑھاتے رہو۔“

”اور جو ایکسیڈنٹ ہو جائے تو۔“ حمید نے کہا۔

”اس کی پرواہ تم مت کرو۔ اس وقت ایکسیڈنٹ کا کوئی امکان نہیں اور پھر ہم تو جنگل کی طرف جارہے ہیں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ اسی طرح اندھا دُھند بھاگتے رہیں گے اور لوگ ہمارا پیچھا کرتے رہیں گے۔ جب ہماری گاڑی کا پیٹرول ختم ہو جائے گا تو ہم دھر لیے جائیں گے۔“ حمید نے کہا۔

”کون جانے اِن کی لاری کا پٹرول پہلے ختم ہو جائے۔“ فریدی نے کہا۔

"اگر آپ اسی بھروسہ پر بیٹھے ہیں تب تو ہو چکا۔" حمید کی آواز میں بیزاری سی تھی۔

"اچھا ٹھہرو! میں اس لونڈے کو بیوقوف بناتا ہوں۔ اگلے موڑ پر کار آہستہ کر دینا میں اتر جاؤں گا اور پھر تم تیزی سے آگے بڑھ جانا۔"

"اس سے کیا ہو گا۔" حمید نے کہا۔

"میں پولیس کی لاری روک کر تمہیں نکل جانے کا موقع دوں گا۔ راستہ تو تم نے دیکھا ہی ہے۔" فریدی نے کہا۔

حمید خاموش رہا۔

"رفتار دھیمی کرو۔۔۔!" فریدی نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "لاری نظر نہیں آرہی ہے جلدی کرو۔"

حمید نے کار کی رفتار دھیمی کر دی۔

فریدی آہستہ سے اتر گیا اور کار پھر فرّاٹے بھرنے لگی۔ فریدی سڑک کے کنارے اونچی اونچی جھاڑیوں کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی پولیس کی لاری دکھائی دی اس نے اپنے پستول سے اسی طرف فائر کرنے شروع کر دیئے جدھر حمید کی کار گئی تھی۔

جگدیش نے فائروں کی آواز سُن کر لاری رکوادی۔ فریدی بدستور فائر کئے جارہا تھا۔ پولیس والے اس کی طرف دوڑے، دفعتاً کسی نے جھاڑیوں کے پیچھے سے فریدی کو اندر کھینچ لیا۔ فریدی جھاڑیوں میں اُلجھ کر گِر پڑا، ساتھ ہی دو تین آدمی اس پر ٹوٹ پڑے۔

"جگدیش جگدیش۔۔۔!" فریدی چیخا۔ "دوڑو۔۔۔ ورنہ یہ۔" وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کسی نے اس کا منہ دبادیا۔

پولیس والے جھاڑیوں کے اندر گھُس پڑے۔ جھاڑیوں میں عجیب قسم کا خلفشار برپا تھا۔ تھوڑی دیر میں ریوالوروں کی چنگاریاں چمکنے لگیں۔

پولیس پارٹی نے بھی فائروں کا جواب دینا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد مخالف سمت سے فائر ہونے بند ہو گئے۔ اب پولیس والے آہستہ آہستہ آگے کی طرف رینگ رہے تھے۔

دفعتاً موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ پولیس والے اُٹھ کر سڑک کی طرف بھاگے۔ پولیس کی لاری اندھیری سڑک پر روشنی بکھیرتی ہوئی آگے کی طرف بھاگی جارہی تھی۔

"لو یہ نئی مصیبت آئی۔" جگدیش جھلا کر ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "کمبخت بڑی زبردست چوٹ دے گئے۔ اب تم سب لوگ اپنی اپنی نوکریوں کو رو پیٹ لو۔۔۔لاری گئی۔"

"تو سرکار اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ کسی ایک کی ڈیوٹی موٹر پر لگا دی ہوتی۔" ایک کانسٹیبل نے کہا۔

"ہاں ہاں اب مجھی پر تو سارا الزام آئے گا۔" جگدیش نے کہا۔ "مگر آخر فریدی

صاحب کہاں کو گئے۔ میں نے ان کی آواز صاف پہچانی تھی، آؤ انہیں تلاش کریں۔"

"اور صاحب لاری کا کیا ہو گا۔" ایک کانسٹیبل بولا۔

"ہو گا کیا۔۔۔ اور اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔ تن بہ تقدیر بیٹھو، جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔"

وہ سب دوبارہ ٹارچوں کی روشنی میں جھاڑیوں میں گھُس پڑے۔ قرب و جوار کا چپّہ چپّہ چھان مارا مگر کسی کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ جہاں فریدی کھڑا تھا وہاں انہیں ایک فلٹ ہیٹ زمین پر پڑی ہوئی ملی جس پر تازہ خون کے دھبّے تھے۔ جگدیش اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھنے لگا۔

"چلو یہ ایک کام کی چیز ملی۔۔۔ شاید اسی سے کوئی سُراغ ملے۔" جگدیش نے کہا۔
"مگر بڑی حیرت کی بات ہے کہ آخر فریدی صاحب کیا ہو گئے۔ میں نے ان کی صاف آواز پہچانی تھی۔"

"حضور آپ کو دھوکا ہوا ہو گا۔۔۔!" ایک کانسٹیبل بولا۔

"ناممکن۔۔۔ میرے کان مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکو انہیں پکڑلے گئے، معلوم نہیں بے چارے پر کیا افتاد پڑی۔"

"ہو گا سرکار۔۔۔ مجھے تو لاری کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔" ایک کانسٹیبل نے کہا۔

"بھئی اب اس کا تذکرہ مت کرو۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ تم میں سے کسی سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ گولی چلا کر لاری کا ایک آدھ ٹائر ہی برسٹ کر دیتا۔" جگدیش نے کہا۔

حیرت

دوسرے دِن صُبح کوتوالی میں ایس پی کے کمرے میں چیف انسپکٹر سی آئی ڈی، سارجنٹ حمید، ایس پی اور انسپکٹر جگدیش بیٹھے تبادلہ خیال کر رہے تھے، میز پر وہی رات والی خون آلود فلٹ ہیٹ رکھی ہوئی تھی۔

”حمید تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ فلٹ ہیٹ فریدی کی ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”ارے صاحب! مُجھ سے زیادہ اسے کون پہچانے گا۔ دیکھئے اس کے اندر سانپ کا سر بنا ہوا ہے یہ فریدی صاحب نے میرے ہی سامنے فاؤنٹین پن سے بنایا تھا۔“

”آخر انہوں نے یہ بنایا ہی کیوں تھا۔“ ایس پی بولا۔

”یونہی بیٹھے باتیں کر رہے تھے فاؤنٹین پین ہاتھ میں تھا۔ ٹوپی گود میں رکھی تھی، باتیں کرتے جاتے تھے اور تصویر بناتے جاتے تھے۔“

”کیا بتاؤں۔۔۔!“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میں نے سینکڑوں بار سمجھایا کہ خواہ مخواہ ہر معاملے میں ٹانگ مت اڑایا کرو، مگر اسے تو جیسے خبط ہو گیا تھا۔ نچلا بیٹھنا تو جانتا ہی نہ تھا، معلوم نہیں کیا حشر ہو۔“

”ارے صاحب کیا بتاؤں ساری غلطی میری اپنی ہے۔ نہ میں ان سے دوستانہ طور پر مدد کا طالب ہوتا اور نہ وہ اس مصیبت میں مبتلا ہوتے۔“ جگدیش نے گلوگیر آواز میں کہا۔ حمید کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”اور صاحب ایسے ڈاکو تو آج تک میری نظروں سے نہیں گزرے۔“ ایس پی بولا۔

”ابھی تک یہی سمجھ میں نہیں آسکا کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں۔ حیرت تو اس پر ہے کہ وہ لاری بھی یہاں چھوڑ گئے، بلا کے دلیر واقع ہوئے ہیں۔“

”اسی چیز نے تو فریدی کو نچلا نہ بیٹھنے دیا، بھلا اس سے اتنا صبر کہاں ہو سکتا تھا کہ وہ باقاعدہ طور پر یہ کیس اپنے ہاتھ میں آنے کا انتظار کرتا۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔

”کچھ بھی ہو، مجھے تو بڑا دکھ ہو رہا ہے۔۔۔!“ ایس پی بولا۔ ”وہ سارے صوبہ میں تو کیا تمام ہندوستان میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو یہ سارے ہندوستان کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہو گا۔“

”اب میں کیا بتاؤں۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میرا تو داہنا بازو ٹوٹ گیا۔ یقین مانے مجھے سچ بات کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ میرے محکمہ کا بھرم اسی کے دم سے قائم تھا۔“

”اس میں کیا شک ہے۔ اس وقت میرا موڈ ٹھیک نہیں۔“ چیف انسپکٹر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کیس کے سارے کاغذات سارجنٹ حمید کے حوالے کر

دیجیئے۔ بہت جلد تفتیش شروع کرا دوں گا۔ یا بہت ممکن ہے کہ خود میں اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لوں۔ کیونکہ فریدی کا اس طرح غائب ہو جانا میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔"

چیف انسپکٹر کے چلے جانے کے بعد حمید نے کاغذات لیے اور دفتر جانے کی بجائے سیدھا گھر آیا۔ سب سے پہلے اسے وہ کام انجام دینا تھا جس کے لیے اتنی دردسری مول لی گئی تھی۔ سو روپے کا نوٹ انہی کاغذات میں نتھی تھا۔ اُس نے وہ نوٹ نکال کر اس کی جگہ دوسرا نوٹ نتھی کر دیا۔ لیکن اب زحمت یہ آ پڑی تھی کہ نوٹ کا وہ نمبر کس طرح مٹایا جائے جو جگدیش نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔ حمید تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اس طرح چونکا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ اٹھا اور فریدی کے عجائبات کے کمرے سے ایک شیشی نکال لایا۔ جس میں سفید رنگ کی کوئی سیال شے تھی۔ یہ ایک سیاہی اڑانے کا نادر و نایاب لوشن تھا، جسے فریدی نے ایک نیپالی سیّاح سے بنوایا تھا۔ لوشن لگاتے ہی نوٹ کا نمبر کاغذ سے اس طرح غائب ہو گیا جیسے وہاں کبھی کچھ لکھا ہی نہ گیا تھا۔ کاغذ خشک ہو جانے کے بعد حمید

نے اسی جگہ اپنے لگے ہوئے نوٹ کے نمبر لکھ دیئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ آنکھیں بند کر کے آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اس کا دماغ بالکل منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اب کیا کرے، پتہ نہیں وہ لوگ فریدی کو پکڑ کر لے گئے یا انہوں نے ان کو قتل کر ڈالا۔ فلٹ ہیٹ پر خون کے دھبّے کوئی اچھا شگون نہیں۔ کبھی وہ سوچتا ممکن ہے کہ فریدی مصلحتاً غائب ہو گیا ہو۔ اس سے قبل بھی وہ کئی بار غائب ہو چکا تھا۔ مگر اس بار تو اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا۔ آخر یہ لوگوں کے گھروں میں گھُستے پھرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جسے فریدی سیٹھ اگروال کی تجوری سے نکال کر لایا تھا۔ یقیناً وہ چیز انتہائی حیرت انگیز ہو گی جس کی چوری پر اس کا مالک بھی منہ نہیں کھول سکتا۔ عجیب قسم کا گورکھ دھندا تھا۔ آخر سیٹھ اگروال نے پولیس کو دھوکے میں کیوں رکھا ہے۔ جبکہ حقیقتاً کوئی چیز اس کی تجوری سے چرالی گئی ہے لیکن وہ پولیس کو بتاتا کیوں نہیں۔

آفس کا وقت ہو گیا تھا۔ حمید نے کھانا کھا کر کپڑے بدلے اور کاغذات جیب میں رکھ کر آفس جانے کے لیے باہر نکلا۔ فریدی کی بڑی کار کئی دِن سے خراب تھی۔

اس لیے آج کل بس پر بیٹھ کر آفس جانا پڑتا تھا۔ وہ چوراہے تک پیدل آیا اور انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد بس آئی اور وہ اس پر بیٹھ گیا۔ بس میں بھیڑ بہت زیادہ تھی اس لیے اسے کھڑے رہنا پڑا۔

آفس پہنچ کر وہ سیدھا چیف انسپکٹر کے کمرے میں گیا۔ وہ کچھ لکھ رہا تھا۔ حمید کو دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کر کے پھر لکھنے لگا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا بات ہے۔" چیف انسپکٹر قلم رکھ کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"کیا عرض کروں۔۔۔!" حمید نے کہا۔

"کیا تم اس سے پہلے سے واقف تھے کہ فریدی جگدیش کے کہنے پر اس کیس کی تفتیش کر رہا تھا۔" چیف انسپکٹر نے کہا۔

"جی نہیں۔۔۔ میرے خیال سے تو انھوں نے اسے ٹالنے کے کچھ یونہی سے جملے کہہ دیئے تھے۔"

”مگر جگدیش تو کہتا ہے کہ فریدی نے اسے موقع واردات پر آواز دی تھی۔“

”ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو لیکن یہ بات میرے علم میں نہیں۔“

”اچھا وہ کاغذات لائے ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔!“حمید نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ لیکن یک بیک اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ یک بعد دیگرے وہ اپنی ساری جیبوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔

”کیوں کیا بات ہے۔“انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

”مم۔۔۔ مم۔۔۔ معلوم۔۔۔ ہوتا ہے کہ۔۔۔ کسی نے جیب سے نکال لیا۔“

”کیا مطلب۔۔۔؟“

”جی ہاں! میں نے اسی جیب میں رکھے تھے۔“

”کمال کیا تم نے۔۔۔ یہ جیب کبھی اس طرح کے کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔

اس میں تو کوئی بچّہ بھی چیز نہایت آسانی سے نکال سکتا ہے۔"

"جی کیا بتاؤں۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔!"

"اب مگر مگر کیا کر رہے ہو۔ جاؤ تلاش کرو۔۔۔!" چیف انسپکٹر تیز لہجہ میں بولا۔

حمید بوکھلا کر کمرے سے نکل آیا۔

وہ تیزی سے روڈ پر بس کے اگلے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ راہ میں اس نے ایک ٹیکسی کی اور بس کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے چوراہے کے سپاہی سے اس بس کی تمام تفصیلات پوچھیں اور ٹیکسی پھر چل پڑی۔ تھوڑی دیر میں اس نے بس کو جالیا۔ بس قریب قریب خالی ہو چکی تھی صرف دو چار مسافر رہ گئے تھے۔ حمید سیٹوں کے نیچے کاغذات تلاش کرنے لگا۔

"آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔" بس کنڈیکٹر نے پوچھا۔

"بھئی میری جیب میں کچھ کاغذات تھے جو غالباً اس بس میں نکل گئے۔"

”کیا کوئی لفافہ تھا۔“

”جی ہاں۔۔۔ سرخ رنگ کا بڑا لفافہ۔“

”یہ لیجئے۔۔۔! بس کنڈیکٹر نے اپنے چمڑے کے تھیلے سے ایک لفافہ نکالتے ہوئے کہا۔“ ایک صاحب نے مجھے دیا تھا۔

حمید نے سب سے پہلے کاغذات نکال کر دیکھے پھر یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ سب کاغذات موجود ہیں، اس نے بس کنڈیکٹر سے اس آدمی کے متعلّق دریافت کیا جس نے اسے لفافہ دیا تھا۔

”اس کی شکل وصورت تو مجھے یاد نہیں البتّہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کسی اچھی سوسائٹی کا آدمی تھا۔“

”اس نے کیا کہہ کر یہ لفافہ آپ کو دیا تھا۔“

”یہی کہ شاید کسی کا گر گیا ہے، آپ اسے احتیاطاً اپنے پاس رکھیئے!“ کنڈیکٹر نے کہا۔

خوفناک دھماکے

کاغذات لے کر آفس کی طرف لوٹتے ہوئے حمید سوچ رہا تھا کہ وہ چیف انسپکٹر سے کہے کہ وہ دراصل کاغذات گھر بھول آیا تھا۔ لیکن ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آہستہ آہستہ شعور کی طرف رینگنے لگا۔ نہیں وہ چیف انسپکٹر کو ٹھیک ٹھیک بتا دے گا کہ اسے یہ کاغذات بس کنڈیکٹر سے ملے اسی طرح وہ دوسرا نوٹ لگانے اور نمبروں کے غلط اندراج کے الزام سے بچ سکے گا۔ بہت ممکن ہے کہ کبھی یہ راز کھل ہی جائے تو وہ نہایت آسانی سے کہہ سکے گا کہ کسی نے وہ

کاغذات اسی لیے اس کی جیب سے نکالے تھے کہ نوٹ بدل دیا جائے، اس نئے خیال پر اس کا اضمحلال بہت کچھ دور ہو گیا۔

آفس پہنچ کر اس نے کاغذات چیف انسپکٹر کے حوالہ کر دیئے اور خود اپنی میز پر آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد چیف انسپکٹر کے کمرے میں اس کی طلبی ہوئی۔

”کہو بھئی۔۔۔ پھر تم نے اب کیا سوچا۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔

”کیا عرض کروں، میری تو عقل ہی جواب دے چکی ہے۔“

”بات ہی ایسی ہے۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میرے خیال سے تو چلو پہلے موقعہ واردات تک ہو آئیں اس کے بعد سیٹھ اگروال کے یہاں چلیں گے۔“

”بہتر ہے۔۔۔!“

چیف انسپکٹر نے جگدیش کو فون کیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ بعد جگدیش پہنچ گیا اور پھر تینوں موقعہ واردات کی طرف روانہ ہو گئے۔

”جی ہاں، کار رُکوائیے۔۔۔“بس یہی وہ مقام ہے۔ جگدیش نے کہا۔

کار رکی اور تینوں جھاڑیوں کے قریب اتر پڑے، چیف انسپکٹر بہت غور سے زمین کے ایک ایک حصّہ کا جائزہ لے رہا تھا۔

”ارے یہ جوتا کیسا۔۔۔!“ چیف انسپکٹر نے جھاڑیوں میں سے ایک جوتا نکالتے ہوئے کہا۔ حمید چونک پڑا۔

”یہ بھی فریدی صاحب کا ہے۔“حمید نے بے ساختہ کہا۔

”عجیب معاملہ ہے۔ اس پر بھی خون کے دھبّے ہیں، خدا خیر کرے۔“ چیف انسپکٹر نے پریشانی کے لہجہ میں کہا۔

”صاحب میرا خیال تو ہے کہ شاید وہ مصلحتاً غائب ہو گئے ہیں۔“حمید نے کہا۔

”جب وہ کوئی زیادہ خطرناک کام کرتے ہیں تو اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ مجھے بھی اس کی اطلاع نہیں ہونے پاتی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”میں اسے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔“

حمید نے جوتے کو ایک اخبار کے ٹکڑے میں لپیٹ کر کار میں رکھ دیا۔ ”میرے خیال سے تو یہاں کسی قسم کا سُراغ ملنا مشکل ہے۔“ حمید نے کہا۔

”تو پھر اب کیا کیا جائے۔“ جگدیش بولا۔

”سیٹھ اگر وال اور وہ دوسرے لوگ جن کے یہاں وارداتیں ہو چکی ہیں ان سے ملنا چاہیے۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔

تینوں دِن بھر اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے لیکن کوئی خاص بات نہ معلوم ہو سکی۔ سیٹھ اگر وال کی تجوری کا حمید نے خاص طور سے جائزہ لیا اس نے سیٹھ اگر وال سے بہت سارے سوالات کیے۔

”کیوں سیٹھ صاحب ڈاکوؤں کے فرار ہونے کے بعد آپ نے اپنی تجوری اچھی طرح دیکھی تھی نا۔“ حمید نے پوچھا۔ ”تجوری آپ نے بند پائی تھی یا کھلی۔“

”کھلی۔۔۔!“

”لیکن کوئی چیز گئی نہیں تھی۔“

”جی نہیں۔“

”سخت حیرت کی بات ہے۔“ چیف نے کہا۔

”اچھا یہ بتایئے کیا ڈاکوؤں نے تجوری کی کنجی آپ سے حاصل کی تھی۔“

”جی نہیں۔“

”تالا توڑا تھا۔“

”یہ بھی نہیں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے آپ کی تجوری کنجی سے کھولی تھی۔“

”اب اس کے متعلّق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”بہت ممکن ہے۔“ حمید نے چیف انسپکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ڈاکوؤں نے

کوئی ایسی چیز اُڑائی ہو جس کا اظہار خود سیٹھ صاحب کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔"

اگروال اس جملہ پر بوکھلا گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کے چہرے کی ساری رونق چھین لی ہو۔

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔"سیٹھ اگروال نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کیا شہر میں جتنی وارداتیں ہوئی ہیں سب اسی قسم کی ہیں۔ شہر میں اور لوگ بھی تو ایسے ہیں جن کے ہاں ڈاکو گھُسے، تجوریاں کھولیں اور جوں کی توں کھلی چھوڑ کر چلے گئے۔ ان میں سے کسی نے بھی نہیں کہا کہ ان کے یہاں سے کوئی چیز چوری ہو گئی ہے۔"

"یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" چیف نے کہا۔

حمید دِل ہی دِل میں فریدی کی ذہانت کی داد دینے لگا۔

"شام کو تقریباً ساڑھے چھ بجے وہ گھر واپس آیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا، اسے یہ دیکھ

کر نوکروں پر سخت غصّہ آیا کہ انہوں نے ابھی تک بر آمدے کی بجلی نہیں جلائی تھی۔ وہ جھلّاتا ہوا بر آمدے میں داخل ہوا۔ پہلا ہی پیر اندر رکھا تھا کہ دھماکے کی آواز سُنائی دی، حمید اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ دوسرا پیر زمین پر پڑا تھا کہ بیک وقت دو دھماکے سنائی دیئے۔ حمید پھر اُچھلا۔۔۔ پھر دھماکہ ہوا۔۔۔ جیسے جیسے وہ بر آمدے میں اُچھلتا پھِر رہا تھا دھماکوں کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ سارے نوکر بھاگ کر اُدھر ہی چلے آئے تھے اور سب حیرت سے اُسے اُچھلتا ہوا دیکھ رہے تھے، ہر دھماکے کے ساتھ حمید کے پیروں سے چنگاریاں نکلتی معلوم ہوتی تھیں، آخر کار وہ بوکھلا کر بر آمدے سے نیچے کود آیا۔ سارے نوکر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

"اے گدھو۔۔۔ تم نے بر آمدے کی بجلی کیوں نہیں جلائی۔" وہ گرج کر بولا۔

"سرکار۔۔۔ ابھی ابھی یہاں روشنی کر کے گیا ہوں!" ایک نوکر نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا۔

”اچھا چلو جا کر بجلی جلاؤ۔“حمید نے کہا۔

وہ ڈرتے ڈرتے بر آمدے میں گیا وہ سوئچ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کے پیروں کے نیچے دھماکہ ہوا اور وہ چیخ کر نیچے آیا۔

سارے نوکر گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے، حمید چیختا ہی رہ گیا لیکن کسی نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ حمید ایک لمحہ تک کھڑا سوچتا رہا پھر جیب سے دیا سلائی نکال کر ایک تیلی جلائی اور اس کی روشنی میں بر آمدے میں داخل ہوا۔

”ارے۔۔۔!“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور وہ اس طرح چلنے لگا جیسے کسی چیز کو بچا بچا کر قدم رکھ رہا ہو، سوئچ بورڈ نزدیک ہی تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر بجلی جلا دی، وہ حیرت سے بر آمدے کے فرش کو گھور رہا تھا۔ فرش پر بے شمار چھوٹی چھوٹی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ حمید نے ایک گولی پر پیر رکھ دیا۔ پیر رکھتے ہی پھر دھماکہ ہوا۔ دفعتاً ایک خیال سرعت سے اس کے ذہن کے گوشوں سے ٹکرایا، وہ دوڑتا ہوا اس کمرے کی طرف جا رہا تھا جہاں تجوری رکھی ہوئی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھُلا ہوا تھا، اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے دیا سلائی جلائی، تجوری کھلی ہوئی نظر آئی۔ دیا سلائی پھینک کر اس نے جلدی سے بجلی جلائی اور تجوری پر جھک پڑا۔ اس کی دانست میں جتنی چیزیں پہلے تھیں اتنی ہی اب بھی موجود تھیں۔ وہ پریشانی میں اپنا ماتھا رگڑنے لگا۔ دفعتاً اسے نوٹوں کے بنڈل پر ایک کاغذ رکھا ہوا نظر آیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب صُبح اس نے سرکاری کاغذات والا نوٹ بدلنے کے لئے تجوری کھولی تھی اس وقت وہ کاغذ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے کاغذ اٹھالیا اس پر انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی تحریر تھی۔

"جاسوس کے بچّے۔

تیرے اُستاد نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ اس وقت وہ میری قید میں ہے۔ جو چیز وہ سیٹھ اگروال کے یہاں سے اُڑا کر لایا تھا میں لیے جا رہا ہوں۔ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو مجھے تلاش کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میرے پیچھے لگنے کی سزا موت ہے۔"

حمید نے اس کاغذ کو احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا اور تجوری کا ڈھکن بند کر کے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ابھی وہ برآمدے ہی میں تھا کہ سڑک پر ایک کار اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ بھاگ کر پھاٹک پر آیا، کار مغرب کی طرف تیزی سے چلی جارہی تھی۔ حمید نے جھنجھلاہٹ میں اپنے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ فریدی کی کار بھی بگڑی پڑی تھی، چھوٹی کار نکالنے کی ہمّت نہ پڑی کیونکہ اس پر ابھی تک ہرا ہی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ آخر بوکھلاہٹ میں اس نے اسی طرف دوڑنا شروع کر دیا جدھر وہ کار گئی تھی۔ خوش قسمتی سے تھوڑی ہی دُور پر ایک خالی ٹیکسی کھڑی ہوئی مل گئی۔ حمید دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔

"کہاں چلیئے گا۔۔۔!" ڈرائیور نے کہا۔

"ادھر کوئی چاکلیٹی رنگ کی کار گئی ہے۔"

"جی ہاں ابھی ابھی گذری ہے۔"

"اس کا پیچھا کرو۔"

ڈرائیور نے معنی خیز انداز میں سر ہلا کر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک چاکلیٹی رنگ کی کار دکھائی دی۔ اس کی رفتار بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ حمید نے بھی ٹیکسی کی رفتار فاصلہ کی مناسبت سے کم کرا دی۔ کار اچانک ایک گلی میں گھوم گئی۔ حمید کی ٹیکسی جیسے ہی گلی کے سامنے پہنچی اس نے چاکلیٹی رنگ کی کار سے ایک عجیب الخلقت آدمی کو اُترتے دیکھا۔ حمید نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کو رُکوایا اور کرایہ دے کر اتر پڑا۔

گلی میں میونسپلٹی کی لالٹینوں کی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کار ابھی تک وہیں کھڑی تھی اور اس میں سے اترنے والا آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا آگے کی طرف جا رہا تھا۔ حمید چھپتا چھپاتا اس کا تعاقب کر رہا تھا اور ابھی مشکل سے سات بجے ہوں گے لیکن گلی بالکل سنسان تھی۔ کار سے اترنے والا پُر پیچ گلیوں سے گذرتا ہوا نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔۔۔ پھر دوسری شاہراہ پر آگیا، یہاں بجلی کے قمقموں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اب حمید نے غور سے دیکھا، اتنی خوفناک شکل آج تک اس کی نظروں سے نہ گذری تھی۔

بھیانک چہرہ

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سارے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی ہو۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ واپس لوٹ جائے۔ ابھی وہ اسی تذبذب میں پڑا ہوا تھا کہ خوفناک آدمی ایک ہوٹل میں گھُس گیا۔ حمید شش و پنج میں پڑ گیا کہ وہ اندر جائے یا نہ جائے۔ پھر دفعتاً اسے اپنی اس کمزوری پر غصّہ آنے لگا۔ یہ کیا حماقت ہے۔ آخر خوف کی کیا وجہ ہے اور پھر اس کا پیشہ ہی ایسا ہے کہ کسی وقت بھی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ حمید بھی ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ شراب اور تمباکو کے دھوئیں کی ملی جلی بُو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں زیادہ تر

متوسط طبقہ کے اوباش لوگوں کا مجمع نظر آیا کرتا تھا شہر کے بدنام ہوٹلوں میں سے یہ بھی ایک تھا۔ یہاں آئے دِن نت نئی وارداتیں ہوا کرتی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پولیس نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں۔

بات دراصل یہ تھی کہ اس کا مالک سنتوش ایک ذی اثر آدمی تھا۔ آئے دِن بڑے بڑے افسروں کی دعوتیں کیا کرتا تھا۔ اونچی سوسائٹی میں اسے کافی مقبولیت حاصل تھی۔ حمید ہوٹل کے اندر چلا تو گیا لیکن اسے یہ سوچ کر اُلجھن ہونے لگی کہ وہ یہاں کرے گا کیا۔ کیونکہ یہاں آنے والے زیادہ تر شرابی تھے۔ کوئی شریف آدمی مشکل ہی سے اِدھر کا رُخ کرتا تھا۔ حمید شراب نہیں پیتا تھا۔ لیکن اب تو آ ہی گیا تھا اور اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا وہ ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ بھیانک چہرے والا آدمی ٹھیک اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بار اس کی اور حمید کی نظریں مل گئیں۔ حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے جسم سے برقی تار مس کر دیا ہو۔ اس کا چہرہ انتہائی خوفناک تھا۔ موٹی سی ناک درمیان میں دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ نتھنے کافی چوڑے تھے جن کے گرد گھنی

مونچھیں بہت زیادہ ڈراؤنی معلوم ہوتی تھیں۔ مونچھیں اتنی گھنی تھیں کہ دہانہ صاف نہیں دکھائی دیتا تھا۔ سر پر بڑے بڑے گھنگھریالے بال تھے، گھنے ابروؤں کے نیچے انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھیں کسی تاریک قبرستان میں جلتے ہوئے چراغوں سے کم خوفناک نہ تھیں۔ سانس لیتے وقت اس کے نتھنے پھولتے پچکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ رخساروں پر کئی گہرے زخموں کے نشانات تھے۔ اس نے بیرے کو آواز دے کر شراب منگوائی اور پوری بوتل اتنی جلدی ختم کر دی جیسے اس نے شراب کی بجائے پانی پیا ہو۔ اس نے شراب اتنے بھونڈے پن کے ساتھ پی تھی کہ ابھی تک اس کی ٹھوڑی سے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس نے انتہائی لاپروائی کے ساتھ ہاتھ سے منہ پونچھا اور کرسی سے ٹیک لگا کر اپنا بھدا سا پائپ سلگانے لگا۔ حمید سوچ رہا تھا۔۔۔ تو یہی حضرت تھے جنھوں نے فریدی کی تجوری کھولی تھی۔ انتہائی چالاک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس نے برآمدے میں اس لیے پٹاخے ڈال یے تھے کہ آنے والوں کی آہٹ مل سکے۔ بلا کا مکّار معلوم ہوتا ہے۔ اب حمید اسی فکر میں تھا۔ کہ اس سے وہ چیز کس طرح حاصل کی جائے

جو اس نے فریدی کی تجوری سے نکال لی تھی۔ لیکن صُبح تو اسے تجوری میں کوئی چیز نہیں دکھائی دی تھی۔ پھر آخر اس میں سے کیا نکالا۔

دفعتاً حمید چونک پڑا۔ ایک بیرا نہایت خاموشی سے اس کی میز کے قریب آ گیا تھا۔

"بئیر اور مٹن چاپ۔" حمید نے آہستہ سے کہا۔ بیرا اسے کوئی اناڑی پینے والا سمجھ کر مُسکراتا ہوا چلا گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ ایک کشتی میں گولڈن ایگل کی ایک بوتل اور کچھ مٹن چاپ لے کر واپس آیا۔ "صاحب اگر کاک ٹیل پئیں تو لاؤں، ٹماٹر کی ہے، اور ابھی تیّار کی ہے۔" بیرے نے میز پر کشتی رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔۔۔!" حمید نے کہا اور بوتل اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ بیرے نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر کاک نکالی اور میز پر رکھ کر گلاس آگے سرکا دیا۔

"کچھ اور صاحب۔۔۔!" اس نے جھک کر مؤدبانہ کہا۔

"نہیں۔۔۔!" حمید نے کہا اور گلاس میں بیئر انڈیلنے لگا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے اس خوفناک آدمی کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے کرسی پر نیم دراز تھا۔ حمید اپنا گلاس بھر کر اس میں ناچتے ہوئے بلبلوں کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ مٹن چاپ کھانے لگا۔ گلاس جوں کا توں بھرا ہوا رکھا تھا۔ پینے کی ہمّت نہیں پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بیرا پھر ادھر سے گذرا۔ "اے بیرا۔۔۔ بل لاؤ۔ حمید نے اسے روک کر کہا۔

"کیوں صاحب کیا قصور ہوا۔"

"نہیں بھائی۔۔۔ اس میں قصور کی کیا بات ہے۔"

"ابھی تو آپ کی سب چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔"

"تمہیں اس سے کیا۔"

"بہت بہتر حضور۔"

بیرا بل لے کر واپس آیا۔ حمید نے پلیٹ میں کچھ نوٹ رکھ دیے۔ بیرا سلام کر کے چلا گیا۔ حمید نے سگریٹ سلگائی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر منہ سے دھوئیں کے دائرے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

بھیانک چہرے والا یک بیک چونک کر کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگا جہاں ایک خوش پوش آدمی کھڑا بارمین سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بھی اُٹھ کر اُس کی طرف چلا گیا۔ خوش پوش آدمی کے قریب کھڑے ہو کر اس نے گرج دار آواز میں کہا۔۔۔

"بل۔۔۔!"

بارمین نے بیرے کو آواز دی۔

"صاحب کا کتنا ہوا۔" اس نے بیرے سے پوچھا۔

"ساڑھے بارہ۔۔۔!" بیرے نے کہا۔

خوفناک چہرے والا دس دس کے دو نوٹ کاؤنٹر پر رکھ کر واپس ہونے کے لیے مُڑا۔

”صاحب بقیہ روپے تو لیتے جایئے۔“ بار میں بولا۔

”بقیہ تمہارا بخشش۔۔۔!“ خوفناک چہرے والے نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ابھی وہ ہوٹل سے بظاہر قدم نہ نکالنے پایا تھا کہ ایک قوی ہیکل آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ خوفناک چہرے والے نے اُسے اِس طرح گھورا جیسے کچا کھا جائے گا۔ قوی ہیکل آدمی مُسکرایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لاؤنج کی طرف جانے لگا۔ بھیانک چہرے والا نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ جا رہا تھا۔ حمید بھی اُٹھ کر پیچھے چلا۔ جب انہیں اندر داخل ہوئے پانچ منٹ گذر گئے تو وہ بھی لڑکھڑاتا اور ہچکیاں لیتا ہوا لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ حمید نے ایک بھونڈا سا گانا گانا شروع کر دیا۔ قوی ہیکل آدمی نے آکر اس کی گردن دبوچ لی۔

”کیوں ہلڑ مچاتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہم گانا گاتی ہے بھائی، ہم تم کو بھی سنائے گی۔“ حمید نے ہچکی لی اور شرابی کا پارٹ

ادا کرنا شروع کیا۔

”معلوم ہوتا ہے بہت چڑھ گئی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کہاں چڑھ گئی ہے۔“ حمید نے نیچے سے اوپر تک اپنا جسم ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”واہ بیٹا۔۔۔!“ قوی ہیکل آدمی بے اختیار ہنس پڑا اور حمید بے سدھ ہو کر ایک صوفے پر گر گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بالکل بے ہوش ہو گیا ہو۔ لیکن ہچکیاں بدستور جاری تھیں۔

قوی ہیکل آدمی پھر بھیانک چہرے والے کے پاس جا بیٹھا۔

”تم نے اس کا منی بیگ اُڑایا تو بہت صفائی سے مگر اُستادوں کی نظروں سے کہاں چھپ سکتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”اچھا جی۔۔۔!“ بھیانک چہرے والا بولا۔

”آدمی تاؤ باز معلوم ہوتے ہو۔“

”تو پھر۔۔۔!“

”نکالو۔۔۔ آدھے آدھے کی رہی۔“قوی ہیکل آدمی نے کہا۔

بھیانک چہرے والا ہنسنے لگا۔

”تو نہ جانے کیسی بات کر رہا ہے، تلاشی لے لے میرے یار، تجھے دھوکا ہوا ہے۔“ بھیانک چہرے والے نے کہا۔

دوسرے آدمی نے اچھی طرح اس کی جامہ تلاشی لی۔ وہ کھڑا مُسکراتا رہا۔

”سچ مچ مجھے دھوکا ہوا۔“اس نے بیٹھ کر شرمندگی کے لہجہ میں کہا۔

”اچھا اب دیکھ۔۔۔ یہ رہا منی بیگ۔۔۔!“ بھیانک چہرے والے نے نہ جانے کہاں سے منی بیگ نکال کر اس کے چہرے کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔

اچانک قوی ہیکل آدمی نے پستول نکال لیا۔

”خبردار۔۔۔ منی بیگ میرے حوالے کر دو۔ میں جاسوس ہوں۔“

”ابے جا، تیرے جیسے بہت سے جاسوس دیکھے ہیں، ابھی ابھی ایک جاسوس کے پٹھے کو اُلّو بنا کر آرہا ہوں۔ ابے پہلے اپنی صورت تو دیکھ۔“ بھیانک چہرے والے نے اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ کر اس کی کنپٹی پر اس زور کا گھونسہ رسید کیا کہ پستول اس کے ہاتھ میں آگیا اور قوی ہیکل آدمی ایک تنکے کی طرح اچھل کر دُور جا گرا۔ بھیانک چہرے والے نے قہقہہ لگایا، پھر وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ قوی ہیکل آدمی ابھی تک چاروں شانے چِت فرش پر پڑا ہوا تھا۔ قوی ہیکل آدمی بھیگی بلّی کی طرح چُپ چاپ اُٹھ بیٹھا۔

”میں نے ابھی تک یہ بھی نہیں دیکھا کہ اس میں ہے کتنا۔“ بھیانک چہرے والے نے منی بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ ”چہ چہ۔۔۔ صرف دو سو روپے۔۔۔ کوئی غریب آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بے چارے کا منی بیگ پھر اس کی جیب میں رکھ دینا چاہیے۔“

”کیوں۔۔۔ واپس کیوں کرو گے۔“ قوی ہیکل آدمی بولا۔

”ابے میں کوئی معمولی چور اچکا یا گرہ کٹ نہیں ہوں۔ اتنی چھوٹی رقمیں تو میں محلہ کے لونڈوں کو بانٹ دیتا ہوں۔“

”یار تم تو بڑے کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ چلو تمہیں اپنے استاد سے ملاؤں۔“

”وہ بھی تیری ہی طرح لونڈا ہو گا۔“

”ہے تو لونڈا ہی، پر بڑا بھیانک ہے۔“

”ابے جا، کچھ تو ہے کچھ تیرا اُستاد ہو گا۔ اچھا چل۔۔۔ اب اس کا روپیہ اس کی جیب میں ڈال دیں، ورنہ بے چارا مُفت میں پریشان ہو گا۔“

”واقعی تم عجیب آدمی ہو۔“

”اچھا اب باتیں مت بناؤ۔“ اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ حمید کے قریب رُک گیا اور اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ لیا میرا نمونہ، چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔“ کہہ کر وہ لاؤنج کے باہر چلا گیا۔

قوی ہیکل آدمی بھی اس کے ساتھ تھا۔

تنبیہہ

حمید تھوڑی دیر تک اسی طرح بے سُدھ پڑا رہا۔ اس کا دل بڑی شدّت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک اچھی خاصی حماقت کی تھی۔ تجوری میں اس نے جو تحریر پائی تھی اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ تجوری کھولنے والا اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے بغیر بھیس بدلے اس کے سامنے ہرگز نہ آنا چاہیے تھا۔

ایسی غیر معمولی قوّت رکھنے والا آدمی آج تک اس کی نظروں سے نہ گذرا تھا۔ اس کا گھونسہ تھا یا بجلی کے کرنٹ کا دھچکا۔ جس نے اتنے لحیم شحیم آدمی کو اتنی دُور

اچھال دیا تھا۔ خود اس کی پنڈلی میں جہاں اس نے ٹھوکر ماری تھی اس طرح کا درد ہو رہا تھا جیسے ہڈّی ٹوٹ گئی ہو۔ اس نے کئی بار اُٹھنا چاہا لیکن ہمّت نہ پڑی۔ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں پھر اس سے مُڈ بھیڑ نہ ہو جائے۔ آج سے قبل اس کے دِل میں کبھی اتنی بزدلی کے خیالات نہ پیدا ہوئے تھے۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ ہمّت کر کے اُٹھا، آہستہ آہستہ شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا۔ پنڈلی کی چوٹ لنگڑانے پر مجبور کر رہی تھی۔ بہر حال اس وقت حمید کی حالت کسی پھوہڑ قسم کے شرابی کی سی ہو رہی تھی۔ وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔ حمید سڑک پر آ گیا اور ٹیکسی کر کے گھر پہنچا۔ سب سے پہلے وہ تجوری والے کمرے میں گیا۔ ایک چیز ابھی تک اس کے ذہن میں خلش پیدا کیے ہوئے تھی اور وہ یہ کہ آخر تجوری میں سے کیا چیز غائب ہوئی۔

اس نے تجوری کا جائزہ لینا شروع کیا۔ نچلے خانے میں غور سے دیکھنے پر اسے ایک جگہ ایک پتلی سی دراز نظر آئی۔ وہیں قریب ایک کیل ابھری ہوئی تھی جس کا وہاں پر موجود ہونا بظاہر کوئی معنی نہ رکھتا تھا۔ حمید اس پر ہلکی ہلکی انگلی پھیرنے

لگا۔ بے خیالی میں شائد اس کیل پر دباؤ پڑ گیا۔ دفعتاً ایک کھٹکا ہوا اور وہ دراز پھیلنے لگی۔ یہ ایک پوشیدہ خانہ تھا۔ حمید نے اس میں ہاتھ ڈال دیا، وہ خالی تھا۔ حمید سوچنے لگا۔ ضرور اسی خانہ سے وہ کوئی چیز لے گیا ہے۔ فریدی نے آج تک اسے اس خانہ کے متعلّق نہ بتایا تھا۔ حالانکہ تجوری کی چابی عموماً اس کے پاس رہا کرتی تھی۔ حمید نے تجوری بند کر دی۔ اس کے بعد کمرے کو مقفّل کر کے کھانے کے کمرے میں آیا۔

حمید کھانا کھانے جا ہی رہا تھا کہ شہناز آ گئی۔

”کہیے حمید صاحب، خیریت تو ہے۔ یہ فریدی بھائی کا کیا معاملہ ہے۔ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے۔“ شہناز نے پوچھا۔

”معاملہ اتنا مختصر نہیں کہ چند جملوں میں بتا سکوں۔ بیٹھو کھانا کھاؤ۔۔۔ سب کچھ بتاتا ہوں۔“ حمید نے کہا۔

”کھانا کھا کر آئی ہوں۔“ شہناز نے کہا۔

”تھوڑااور سہی۔“

”نہیں۔۔۔!“

”تمہاری خوشی۔“

”آپ تو ذرا ذرا سی بات پر منہ پھلا لیتے ہیں۔“ شہناز تنک کر بولی۔

”تم غلط سمجھیں۔۔۔ میں ذرا بڑے نوالے کھانے کا عادی اس لیے منہ کا پھولنا یقینی ہے۔“

”تو آخر آپ اس طرح منہ بگاڑ کر کیوں باتیں کر رہے ہیں۔“

”کیا آج لڑنے کا ارادہ کر کے آئی ہو۔“

”لیجئے صاحب چلی جاتی ہوں۔“ شہناز اٹھتے ہوئے بولی۔

”ار۔۔۔ ارے۔۔۔ نہیں بھائی۔“ حمید نے اُٹھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”نہیں میں عرصہ سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کو میری صورت دیکھ کر کچھ

جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔"

"تو میں نے کیا کہہ دیا بابا۔۔۔!" حمید اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ آپ تو بڑے بھولے ہیں۔"

"نہیں۔۔۔ میں اُلّو کا پٹھا ہوں۔"

"کیوں اپنے منہ میاں مٹھو بن رہے ہو۔" شہناز بے اختیار ہنستے ہوئے بولی۔

"خیر تمہیں ہنسی تو آئی۔" حمید نے کہا۔

کھانا کھا چکنے کے بعد حمید نے پوری داستان کہہ سنائی۔ لیکن اپنے اور فریدی کے ڈاکہ ڈالنے کے واقعات نہیں بتائے۔

"میں کیا بتاؤں۔۔۔ میں نے آج تک اتنا بھیانک چہرہ نہیں دیکھا۔" حمید بولا۔

"کہیں وہ فریدی صاحب ہی نہ ہوں۔ کیا آپ کرنل پرکاش والا واقعہ بھول گئے۔" شہناز نے کہا۔

”خیال تو مجھے بھی آیا تھا، لیکن یہ ناممکن ہے۔ فریدی صاحب بھیس ضرور بدل سکتے ہیں لیکن وہ اتنی طاقت کہاں سے لائیں گے۔ سوچ کر حیرت ہوتی ہے بھئی اس کا مدِّ مقابل گھونسہ پڑتے ہی اس بُری طرح اچھلا تھا جیسے ربڑ کی گیند۔“

”واقعی تعجّب کی بات ہے۔“

”اور تو اور یہ دیکھو۔۔۔!“ حمید نے اپنی پتلون کا ایک پائنچا سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”ظالم نے ایک ٹھوکر مجھے بھی رسید کی تھی۔ یہ دیکھو پنڈلی میں ورم آگیا ہے۔“

”بھئی خدا کے لیے آپ اس کے پیچھے مت لگیں۔“

”جو کچھ ہوا میری حماقت سے ہوا۔ جب میں یہ جانتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے تو مجھے بغیر بھیس بدلے اس کے پیچھے جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔“

”ارادہ تو یہی ہے۔“ حمید نے کہا۔

”آخر کیوں۔۔۔؟“

”اس لیے کہ فریدی صاحب کو اسی نے غائب کیا ہے۔“

”بھئی میرا دل تو کہتا ہے کہ وہ فریدی صاحب ہیں۔“ شہناز بولی۔

”یہ بھی ناممکن ہے۔۔۔!“ حمید نے کہا۔ ”مجھ سے زیادہ فریدی صاحب کو کون جانتا ہے۔ وہ اتنے طاقتور ہرگز نہیں۔“

”اچھا تو آؤ پیار کی باتیں کریں۔“ حمید نے کہا۔

”اچھا بس بس رہنے دیجئے۔“ شہناز نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”میں نے یہ کب کہا تھا۔“

”تم کہو یا نہ کہو، ہر عورت مرد سے ہر وقت صرف اپنے متعلّق کچھ سُننا چاہتی ہے۔“ حمید نے کہا۔

”آخر آپ اتنے فلسفی کیوں ہو گئے ہیں۔“ شہناز بولی۔

”فریدی کی صحبت نے مجھے نہ جانے کیا کیا بنا دیا ہے۔“

”اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو۔“ شہناز بولی۔ ”آخر فریدی صاحب شادی کیوں نہیں کرتے۔“

”انہیں عورت سے زیادہ اپنا فن عزیز ہے۔ یہ کچھ فریدی ہی پر منحصر نہیں، ہر فنکار شادی سے گھبراتا ہے۔ وہ عورتوں سے دوستی تو کر سکتا ہے لیکن مستقل طور پر کسی عورت کا پابند ہونا پسند نہیں کرتا۔“

”آخر اس کی وجہ۔۔۔!“ شہناز بولی۔

”بھئی آٹے دال کا چکر۔۔۔ اور کیا۔“ حمید نے زنانہ لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ ”آج ساڑھی نہیں ہے۔ کل بلاؤز کم ہو گئے۔ یہ لپ اسٹک اچھی نہیں میں تو کٹی کیورا پاؤڈر استعمال کروں گی۔ ننھے میاں کے جوتے پھٹ گئے۔ مُنّے میاں کو زکام ہو گیا۔ مُنّی کو چھینکیں آ رہی ہیں۔“

شہناز ہنسنے لگی۔

”غالباً آپ کو بھی اپنا فن بہت زیادہ عزیز ہو گا۔“ شہناز بولی۔

”مجھے۔۔۔ نہیں تو، میں اس محکمہ میں فن کے لیے جھک نہیں مار رہا ہوں۔ اس قسم کی حماقتیں فریدی جیسے لوگ ہی کرتے ہیں۔“

”پھر آخر آپ کس لیے اس محکمہ میں آئے ہیں۔“

”عورت کے لیے۔۔۔!“ حمید نے کہا۔

”کیا مطلب۔“ شہناز تیز لہجہ میں بولی۔

”کوئی خاص مطلب نہیں۔ کسی بے کار آدمی کو تو کوئی اپنی بیٹی دیتا نہیں۔“

”اوہ۔۔۔!“

”اور تم کیا سمجھی تھیں۔“

”کچھ نہیں۔“

”خیر۔۔۔ بہر حال۔۔۔ ہاں تو پھر میں اپنی شادی کب کر رہا ہوں۔“

”میں کیا کروں۔“

”ارے تو کیا تم میرے ساتھ شادی نہ کرو گی۔“

”دیکھئے فضول باتیں نہ کیا کیجئے۔ اگر میرا بیٹھنا ناگوار ہو تو صاف صاف کہہ دیجئے۔“

”اچھا جی۔۔۔ یہ باتیں فضول کب سے ہو گئیں۔“

”جب سے آپ نے اپنا رویّہ بدل دیا۔“

”کیا تمہیں کوئی میرے خلاف بہکایا کرتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔!“

”کون ہے وہ اُلّو کا پٹھا۔“

”میرا دِل۔“

”تب تو وہ آدمی کا پٹھّا ہے۔“ حمید نے جلدی سے کہا۔ ”آخر کیوں۔“

”اس لیے کہ آپ مجھ سے کافی کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک نوکر ہاتھ میں ایک لفافہ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ ”ابھی ابھی ایک آدمی دے گیا ہے۔“ نوکر نے لفافہ حمید کو دیتے ہوئے کہا۔

لفافے پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ حمید نے خط جو انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا لفافے سے نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

”میں دوسری مرتبہ تمہیں متنبہ کر رہا ہوں کہ میرے پیچھے مت لگو، ورنہ انجام کے ذمّہ دار تم خود ہو گے۔ تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ میرے خلاف تمہارے پاس کسی قسم کا کوئی ثبوت نہیں۔ تمہارے استاد بخیریت سے ہیں، میرا جو مقصد تھا حل ہو گیا۔ مجھے تم سے یا ان سے کوئی دُشمنی نہیں۔ میں انہیں جلد چھوڑ دوں گا۔ انہیں میرے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ اگر میں انہیں اس وقت غائب نہ کر دیتا تو وہ حضرت قتل کر دیے جاتے۔ تم دونوں کے کرتوت سے میں

اچھی طرح واقف ہوں۔ تمہارے اُستاد کا قاتل وہی تھا جس نے سیٹھ اگروال پر گولی چلائی تھی۔ وہ آج بھی فریدی کی تلاش میں ہے۔ اگر تم میں تھوڑی سی بھی عقل ہو تو اب میرا پیچھا مت کرنا۔ میں اتنا گھامڑ نہیں ہوں اس سے زیادہ مجھے اب کچھ نہیں کہنا۔“

حمید نے خط پڑھ کر شہناز کی طرف بڑھا دیا۔ خط پڑھتے ہی شہناز کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔

”تو پھر اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔“ شہناز بولی۔

”ارے ایسے ایسے بہت دیکھے ہیں۔ شیر طاقت سے مارتا ہے اور گیدڑ مکاری سے۔ ایسا پھنساؤں بیٹا کہ عمر بھر یاد کریں۔“

”تو آپ اس کا پیچھا کریں گے؟“

”یقیناً۔۔۔!“

”اور میرا کہنا بھی نہ مانیں گے۔“

”بس اسی لیے تو فریدی صاحب شادی نہیں کرتے۔ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔“

”خیر۔۔۔ جو آپ کا دل چاہے کیجیے۔“ شہناز نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”اگر آپ نے میرا کہنا نہ مانا تو اچھا نہ ہو گا۔“

”معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی اس سے ملی ہوئی ہو۔“

”دیکھئے مذاق میں مت ٹالیے۔“ شہناز نے کہا۔ ”اب مجھے بھی زبردستی کرنی پڑے گی۔“

”ورنہ زبردستی کس قسم کی ہو گی۔“ حمید نے مُسکرا کر کہا۔

”وہ بھی دیکھ لیجئے گا۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نہیں چاہتی کہ میری جان خطرے میں پڑے۔“

شہناز نے سر ہلا دیا۔

"آخر کیوں۔۔۔؟"

"بس یونہی۔۔۔!"

"کوئی وجہ۔۔۔!"

"نہیں بتاتی وجہ۔"

"تو ہم بھی نہیں باز آتے۔"

"اگر نہیں باز آتے تو میں زہر کھالوں گی۔"

"تو کیا واقعی تم مجھے اتنا ہی چاہتی ہو۔"

"یہ میں نے کب کہا ہے۔"

"خیر تم اپنی زبان سے کبھی نہ کہو گی۔"

شہناز کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مُسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

"اوہ۔۔۔ گیارہ بج گئے۔" شہناز نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب چلنا

چاہیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر کیا پیدل جاؤ گی۔ اس وقت شائد قریب کوئی سواری بھی نہ مل سکے۔ فریدی صاحب کی کار بگڑی پڑی ہے۔ کل اسے ورکشاپ بھجوادوں گا۔“

”تو کیا ہوا۔۔۔!“ شہناز نے کہا۔ ”ٹہلتی ہوئی چلی جاؤں گی۔“

”میں اسے ٹھیک نہیں سمجھتا۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

”نیکی اور پوچھ پوچھ!“ شہناز نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو کیا اسی طرح چلئے گا۔ جی نہیں السٹر پہن لیجئے بہت سردی ہے۔“

”اچھا بھئی۔“

دونوں آہستہ آہستہ بیلی روڈ کی طرف چل دیے۔ سڑک پر بالکل سنّاٹا تھا۔ تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ پیچھے سے ایک ٹیکسی آ گئی۔ حمید نے آواز دے کر اسے رکوادیا۔

”واقعی تم بڑی خوش قسمت ہو کہ اس وقت ٹیکسی مل گئی۔“

”بیلی روڈ!“ شہناز نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا اور پھر کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔ ”دیکھئے جو کچھ میں نے کہا اس کے خلاف نہ ہونے پائے۔“

”اچھا۔۔۔!“ حمید نے کہا۔ ”شب بخیر۔“

”شب بخیر۔“

ٹیکسی چل پڑی۔ بیلی روڈ پر پہنچ کر ڈرائیور نے پوچھا۔ ”کدھر۔۔۔!“

”پندرہ سو تیس۔۔۔!“ شہناز نے بتایا۔

ٹیکسی شہناز کے مکان کے سامنے رُک گئی۔ ڈرائیور نے اتر کر دروازہ کھولا اور شہناز ٹیکسی سے باہر آئی۔

”یہ لو۔۔۔!“ شہناز نے پرس سے ایک نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

”میں کرایہ نہیں لیتا۔“

شہناز چونک پڑی۔ اس نے نیچے سے اوپر تک اسے دیکھا۔ یہ ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ اس نے اپنے السٹر کے کالر کان کے اوپر تک کھڑے کر رکھے تھے اور نائٹ کیپ چہرے پر جھکا رکھی تھی۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔" شہناز نے اسے گھورتے ہوئے تیز لہجہ میں کہا۔

"میری اجرت صرف اتنی ہے کہ آپ سارجنٹ حمید کو میرا پیچھا کرنے سے کسی طرح روک دیجئے، ورنہ مُفت میں اس کی جان جائے گی۔"

"تو کیا آپ۔۔۔ تو کیا آپ۔۔۔!" شہناز نے لرزتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔۔۔ میں وہی ہوں جس کا تذکرہ آپ سے سارجنٹ حمید نے کیا تھا۔" وہ بولا۔ "مُجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بلا وجہ کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ لیکن اپنے راستے میں آئے ہوئے آدمیوں کو معاف کر دینا میرے بس سے باہر ہوتا ہے۔ اچھا اب جایئے۔۔۔ حمید کو اچھی طرح سمجھایئے گا۔۔۔ شب بخیر۔"

اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔ شہناز متحیّر کھڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی کار کو دیکھ

رہی تھی۔

کچھ نئی باتیں

دوسرے دِن حمید ذرا دیر سے آفس پہنچا۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ چیف انسپکٹر کے یہاں طلبی ہوئی۔

”آج تم دیر میں آئے۔“

”جی ہاں دیر ہو گئی بات یہ ہے کہ کل کافی رات گئے تک ایک مشتبہ آدمی کے پیچھے رہا۔“

”کس کیس کے سلسلہ میں۔“

”انہیں عجیب و غریب ڈاکوؤں کے کیس کے سلسلہ میں۔“

”میرے خیال سے تو ابھی میں نے یہ کیس کسی کے سپرد نہیں کیا۔“

”کیا عرض کروں۔ فریدی صاحب کا اس طرح غائب ہو جانا میرے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ ہے۔“

”اور کہیں تمہارا ابھی غائب ہو جانا ہم سب کے لیے تکلیف دہ نہ ہو جائے۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔ ”تم لوگوں کا اس طرح بغیر کچھ کہے سُنے کوئی کام شروع کر دینا مجھے قطعی ناپسند ہے اور فریدی کو تو جیسے اس کا خبط ہو گیا ہے۔۔۔ خیر یہ دیکھئے۔“

چیف نے ایک کاغذ حمید کی طرف بڑھا دیا جس کے اوپر کسی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ ”کیا تم انہیں پہچان سکتے ہو۔“ چیف نے پوچھا۔ حمید تھوڑی دیر تک ان نشانات کو دیکھتا رہا پھر نفی میں سر ہلا کر چیف کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

چیف نے گھنٹی بجائی۔ ایک سارجنٹ کمرے میں داخل ہوا۔

”ایف دو سو سات۔“

سارجنٹ چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ایک چمڑے کا تھیلا لا کر میز پر رکھا۔ چیف نے تھیلا کھول کر میز پر اُلٹ دیا۔ بہت سے کاغذات میز پر بکھر گئے اس نے ان میں سے ایک کاغذ نکالا اس پر انگلیوں کے نشانات تھے۔ اس نے وہ کاغذ بھی حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”دونوں کو ملاؤ۔“

”دونوں ایک ہی آدمی کی انگلیوں کے نشانات معلوم ہوتے ہیں۔“ حمید نے غور کرتے ہوئے جواب دیا۔

”جانتے ہو کس کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔“ چیف نے کہا۔

حمید کا دل شدّت سے دھڑکنے لگا۔ منہ فق ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہیں یہ نشانات تجوری پر سے تو نہیں حاصل کیے گئے؟ اگر ایسا ہے تو بُرے پھنسے، اس نے چیف کے چہرے کو بغور دیکھا۔ وہ مُسکرا رہا تھا۔ حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دماغ پر گھونسہ رسید کر دیا۔ چیف اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر

بولا۔

"گھبراؤ نہیں۔۔۔سب خیریت ہے۔ فریدی زندہ ہے۔" چیف نے کہا۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"دیکھو فریدی کی عرضی ایک ماہ کے لیے رخصت کے لیے آئی ہے۔" چیف نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ نشانات میں نے اس غرض سے حاصل کئے ہیں۔ عرضی چونکہ ٹائپ کی ہوئی ہے اور اس پر فریدی کے دستخط بھی نہیں ہیں اس لیے مجھے خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ بھی بدمعاشوں کی کوئی چال ہے۔ اس لیے اس پر انگلیوں کے نشانات دیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ میرا خیال ہے کہ فریدی پوشیدہ طور پر تفتیش کر رہا ہے اور یہ معاملہ ہی ایسا ہے کہ وہ پتہ لگائے بغیر نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔"

حمید کے ذہن میں وہ بھیانک چہرہ ناچنے لگا کہ یہ بھی اس کی چال معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ فریدی صاحب تو غائب ہونے کے بعد اپنی پرچھائی تک سے بھڑکتے ہیں۔

ایسی صورت میں ان کا باہر سے چھٹی کی درخواست دے کر جتانا کہ میں یہاں موجود ہوں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عرضی میں یہ بھی نہیں تھا کہ وہ بھیجی کہاں سے گئی ہے۔ اگر خود فریدی صاحب کا ارادہ روپوشی کا ہوتا تو وہ کبھی چھٹی کی درخواست نہ دیتے کیونکہ انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔

"بہرحال حالات ناسازگار ہیں۔" چیف نے کہا۔

"جی ہاں۔۔۔!"

"اچھا کل رات تم پیچھا کس کا کر رہے تھے۔"

"ایک بہت ہی بھیانک آدمی کا جسے میں نے ناولٹی میں دیکھا تھا۔"

"ناولٹی۔۔۔وہی جس کا مالک سنتوش ہے۔"

"جی ہاں۔۔۔!"

"اس پر تو عرصہ سے ہم لوگوں کی نظریں ہیں لیکن کبھی ایسا بہانہ ہاتھ نہیں آتا

کہ اس کا قلع قمع کیا جاسکے۔ وہ عیاشی کا ایک کھلا ہوا اڈہ ہے۔ لیکن کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا جس کی بناء پر کوئی کارروائی کی جاسکے۔"

"دراصل یہی چیز مجھے وہاں لے گئی تھی۔ مجھے شُبہ ہے کہ اس ہوٹل میں عیاشی سے بھی زیادہ بھیانک کوئی کام ہوتا ہے میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ان وارداتوں کے سلسلے میں اس ہوٹل کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور ہے۔" حمید نے کہا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ فریدی کے غائب ہوتے ہی اچانک یہ وارداتیں ہونی کیوں رُک گئیں۔ جب کہ متواتر یہ سلسلہ جاری تھا۔" چیف نے کہا۔

حمید پھر بوکھلا گیا۔

"میرے خیال سے تو اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ فریدی کے غائب ہوتے ہی معاملہ خفیہ پولیس کے سپرد کر دیا گیا ہے۔"

"اچھا ایک اور چیز میری سمجھ میں نہیں آرہی۔" چیف نے کہا۔ "کہ آخر فریدی کی عرضی پر اس کے دستخط کیوں نہیں ہیں۔ ایک جاہل سے جاہل آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ ٹائپ کی ہوئی بغیر دستخط کی عرضیاں منظور نہیں ہوا کرتیں۔ میرا خیال ہے کہ اس عرضی کے سلسلہ میں اس کے ساتھ کوئی زبردستی کی گئی ہے۔ فریدی نے عملاً اِس پر دستخط نہیں کیے تاکہ ہماری توجہ خاص طور پر اس کی جانب مبذول ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" حمید نے کہا۔

"صرف سوچنے سے کام نہ چلے گا۔ ہمیں اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ ابھی تک جو کچھ بھی ہوا ہے میں اس سے مطمئن نہیں ہوں اور یہ طریقہ اختیار کر کے ہم آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ ابھی تک اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ واردات والی رات کو پولیس کی وہ لاری اسٹیشن کے پھاٹک پر دیکھی گئی تھی جسے ڈاکو اُڑا لے گئے تھے جو شخص اس لاری کو چلا رہا تھا اس کے متعلّق سُننے میں آیا ہے کہ وہ اس تصویر سے بہت ملتا جلتا ہے۔" چیف نے میز کی دراز سے ایک

تصویر نکال کر حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ تو وہی ہے۔" حمید کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"کون۔۔۔!"

"رات جس کا میں پیچھا کر رہا تھا۔"

"بہت اچھے۔" چیف انسپکٹر خوشی سے چیخا۔ "تو کیا وہ تمہیں ناولٹی میں ملا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"تو یہ کہو کہ سچ مچ ناولٹی میں آج کل بدمعاشوں کا زور ہو رہا ہے۔" چیف نے کہا۔
"جانتے ہو، یہ کون ہے۔"

حمید نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"دلاور خان مشہور پشاوری قاتل، اس نے بہت سے خون کیے ہیں۔ دس سال ہوئے یہ افغانستان بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد سے قطعی لاپتہ رہا۔ اچانک پھر

دکھائی دیا۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اس کی رہائش گاہ کا بھی پتہ لگایا یا نہیں۔"

"اس کی نوبت ہی نہیں آنے پائی۔ وہ شاید مجھے پہچانتا تھا۔" اس کے بعد حمید نے ہوٹل کی ساری داستان بیان کر دی۔

"بھئی وہ بے پناہ طاقت کا آدمی ہے۔ ایک بار اس نے صرف ایک گھونسہ میں ایک آدمی کی جان لی تھی۔ خیر اگر واقعی وہ اس شہر میں موجود ہے اور اس واردات میں اس کا بھی ہاتھ ہے تو بچ کر نہیں جا سکتا۔"

چیف نے گھنٹی بجائی۔ ایک آدمی اندر آیا۔

"انسپکٹر بینر جی کو سلام دو۔" چیف نے کہا۔

"انسپکٹر بینر جی کو آتا دیکھ کر حمید کھڑا ہو گیا۔"

"آج آپ کو دہلی ایکسپریس دیکھنا ہے۔" چیف نے سب انسپکٹر سے کہا۔

"جی ہاں۔۔۔ میں جا ہی رہا تھا۔" سب انسپکٹر بیز جی انگریزی میں بولا۔ "لیکن

صاحب مجھے کوئی ایسا آدمی دیجیئے جو واقعی کام کا ہو۔"

"حمید کو لے جایئے۔"

"بہتر ہے۔" سب انسپکٹر نے حمید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دہلی ایکسپریس کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ حمید اور انسپکٹر بیز جی پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے دفعتاً حمید ایک آدمی کو دیکھ کر ٹھنک گیا۔ وہ کوئی مارواڑی سیٹھ تھا۔ اس کا سامان پلیٹ فارم پر رکھا ہوا تھا۔ غالباً وہ بھی دہلی ایکسپریس کے انتظار میں تھا۔ حمید کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے اسے گذشتہ رات کو ناولٹی میں دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی حمید کے ذہن میں فوراً خیال گونجنے لگا تھا کہ وہ کیوں نہ آج اس مارواڑی کے بھیس میں ہوٹل جائے۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ مارواڑی اس ہوٹل کا کوئی مُستقل گاہک ہے کیونکہ پچھلی رات وہ کافی دیر تک ہوٹل کے مینجر سے باتیں کرتا رہا تھا اور دونوں کا لہجہ کچھ اس قسم کا تھا جس سے بے تکلّفی کی بُو آتی تھی۔ حمید سوچنے لگا کہ ضرور یہ کوئی لمبا سفر کرنے جارہا ہے۔ تبھی تو اس کے

ساتھ اتنا سامان ہے۔ مگر یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ وہ خود سفر کرے گا۔ بہت ممکن ہے۔ کہ وہ کسی کو رخصت کرنے آیا ہو۔

حمید کی نظریں اس مارواڑی سیٹھ پر تھیں اس کا سامان ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں رکھا جارہا تھا۔ پورا کمپارٹمنٹ ریزرو تھا۔ حمید نے ریزرویشن کارڈ پڑھا ڈبہ بمبئی تک کے لیے ریزرو ہوا تھا۔ مارواڑی کو اس ڈبہ میں تنہا بیٹھے دیکھ کر حمید کی جان میں جان آئی۔ وہ رات کے لیے پروگرام بنانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد انجن نے سیٹی دی اور گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

''کہیے صاحب سب ٹھیک تھا۔'' حمید نے انسپکٹر سے پوچھا۔

''ٹھیک ہی تھا کیونکہ ہمارا لوگ کا ڈیوٹی لگایا جاتا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

آج حمید کے لیے اس وقت اسٹیشن آنا بہت ہی کارآمد ثابت ہوا۔

ہنگامہ

حمید شام کو جب گھر لوٹا تو شہناز کو اپنے انتظار میں پایا۔ حمید کو دیکھتے ہی وہ اچھل کر رات کا واقعہ اتنے سہمے ہوئے لہجے میں بتانے لگی جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں وہ خوفناک چہرے والا یہیں آس پاس چھپا ہوا اس کی گفتگو نہ سن رہا ہو۔

"میں نے خود ہی اپنا فیصلہ بدل دیا ہے کون خواہ مخواہ اپنی جان خطرے میں ڈالے۔" حمید نے کہا۔

"مجھے یقینِ کامل ہے کہ فریدی صاحب بخیریت ہیں اور پوشیدہ طور پر اپنا کام کر

رہے ہیں۔" شہناز نے کہا۔

"میں تو اب تنگ آگیا ہوں۔ خود بلاوجہ خطرے میں پھاند پڑتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی لپیٹ لیتے ہیں۔" حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "اور پھر بعد میں شکایت کرتے ہیں کہ تم نے میری ذرّہ برابر بھی پرواہ نہ کی۔ میں تو بہت جلد اس خدمت سے استعفٰے دے دوں گا۔ میرے پاس اتنا روپیہ اکٹھا ہو گیا ہے کہ بآسانی کوئی تجارت کر سکتا ہوں۔"

"بس بنانے لگے ہوائی قلعے۔" شہناز ہنس کر بولی۔ "کتنا سرمایہ اکٹھا کر لیا ہے آپ نے۔ آپ کی تنخواہ ہے ہی کتنی۔"

"میرے پاس بیس ہزار روپیہ ہے۔"

"بیس ہزار۔۔۔ کہاں ڈاکہ مارا تھا۔"

"ایک مرتبہ ایک کیس کے سلسلہ میں میں نے اور فریدی صاحب نے سادھو بن کر چالیس ہزار روپیہ کمایا تھا۔"

”تو اس میں سے بیس ہزار روپے آپ کو ملے تھے۔“

”نہیں پورے چالیس ہزار، فریدی صاحب اس قسم کی رقمیں نہیں رکھتے اور پھر انہیں کمی کس بات کی ہے۔ لکھنؤ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، لاکھوں روپے کی جائیداد ہے۔“

”تو بقیہ بیس ہزار کیا ہوئے۔“

”بیس ہزار تو الگ ہیں۔ ان کو تو میں ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ بقیہ بیس ہزار میں سے صرف دس ہزار رہ گئے ہیں۔“

”دس ہزار۔۔۔ باقی کیا ہوئے۔“

”کمال کر دیا۔۔۔ ارے بھئی وہ خرچ ہو گئے۔ بھلا کوئی ہندوستانی جاسوس صرف تنخواہ کے بل پر اتنی نوابی کر سکتا ہے۔“

”تو یہ کہیے کہ آپ خیرات کے پیسوں سے مزہ کر رہے ہیں۔“

”خیرات کے کیوں۔“

”خیرات نہیں تو اور کیا۔ سادھو اور فقیروں کو خیرات نہیں دی جاتی تو اور کیا؟ بیچارے غریبوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو آپ لوگوں نے دھوکہ دے کر لوٹ لیا۔“

”ایسا تو نہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”یہ مہارانی صاحبہ کا عطیہ ہے۔ چار سال ہوئے ہم لوگ ایک قاتل کی تلاش میں بنارس گئے وہاں پتہ چلا کہ وہ ایک بہت بڑے گروہ کا سرغنہ ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی اور وہ خود عموماً سادھوؤں کے بھیس میں رہتا ہے۔ لہٰذا ہم لوگوں نے اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ فریدی کی شعبدہ بازیوں کی وجہ سے ہم لوگ بہت جلد مشہور ہو گئے۔ ایک بار فریدی نے کمال کر دیا۔ رات کا وقت تھا۔ فریدی کے دربار میں معتمدین کا جمگھٹا تھا۔ دفعتاً زور کی آندھی چلی، سارے چراغ گُل ہو گئے لیکن فریدی صاحب کا چہرہ اندھیرے میں جگمگا رہا تھا۔ بس پھر کیا تھا نعرے گونجنے لگے۔ آندھی ختم ہو جانے کے بعد چراغ دوبارہ جلا دیے گئے۔ اب ان کا چہرہ اپنی اصلی

حالت میں آ گیا تھا۔ اس دِن کے بعد سے سارا بنارس الٹ پڑا۔ دور دور سے لوگ درشن کے لیے آنے لگے۔ روزانہ ہزاروں روپے کی بھینٹ چڑھتی تھی، لیکن فریدی صاحب سب کو واپس کر دیتے تھے۔ ایک دِن مہارانی صاحبہ اس کے درشن کو آئیں۔ یہ بیچاری اس وقت حاملہ تھیں کہ قدم اٹھانا دو بھر ہو رہا تھا۔ ان کے ساتھ ایک ٹریجڈی تھی اور وہ یہ کہ ان کا ہر بچّہ مُردہ پیدا ہوتا تھا۔ فریدی صاحب نے انہیں بہت زیادہ ڈپٹ کر دعا دی۔ جاتے وقت انہوں نے کچھ نذر کرنا چاہا مگر چونکہ میں فریدی صاحب کی عادت سے واقف تھا اس لیے میں نے ان کے بولنے سے قبل ہی رانی صاحبہ سے کہہ دیا کہ اس کا نام بھی نہ لیجئے گا ورنہ مہاتما جی ناراض ہو جائیں گے۔ مہارانی صاحبہ لوٹ گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فریدی صاحب نے مجھے خوب ڈانٹا اور کہا کہ ایسی موٹی آسامیوں کا مال جائز ہے۔ مہارانی صاحبہ اپنے حمل کے دِن پورے کر رہی تھیں۔ تین چار دِن کے بعد ان کے بچّہ ہوا لیکن اس بار وہ سچ مچ زندہ رہا۔ ایک ہفتہ کے بعد مہاراجہ بہ نفس نفیس تشریف لائے اور ہمارے مہاتما کو ڈنڈوت کر کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ

رہے۔ میرے شیر کے رعب کا یہ عالم تھا کہ مہاراجہ صاحب تھر تھر کانپ رہے تھے۔ آخر ڈرتے ہوئے انہوں نے ہزار ہزار کی چالیس گڈیاں مہاتما کے چرنوں میں رکھ دیں۔ مہاتما نے ایک ٹھوکر رسید کی لیکن میں نے بہت احتیاط سے انہیں اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ مہاراجہ صاحب نے التجا کی کہ ہم لوگ بنارس چھوڑ کر انہی کی ریاست میں رہیں۔ لیکن مہاتما جی نے وہ ڈانٹ پلائی کہ اوسان خطا ہو گئے۔ یہ ہے ان روپیوں کی کہانی۔"

شہناز بڑی توجّہ کے ساتھ سن رہی تھی۔

"آخر ان کا چہرہ چمکنے کیسے لگا تھا۔" شہناز بولی۔

"خود فریدی کے تیّار کردہ ایک نسخہ کی کرامت تھی۔"

"بھئی کمال کرتے ہیں آپ لوگ بھی۔" شہناز نے کہا۔ "اچھا پھر اُس ڈاکو کا کیا ہوا۔"

"دھر لیا گیا!" حمید نے کہا۔ "بھلا فریدی کسی کام میں ہاتھ ڈالے اور وہ ادھورارہ

جائے۔"

"تو بہر حال آپ لوگ اس طرح اچھی خاصی دولت پیدا کر لیتے ہیں۔" شہناز نے کہا۔ "اور اس پر بھی آپ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"کیا کیا جائے۔۔۔ سکون نہیں ملتا۔" حمید بولا۔ "اب یہی دیکھ لو کہ ابھی ابھی دفتر سے آرہا ہوں۔ اب ایک گھنٹہ کے اندر مجھے چیف کے بنگلہ پر پہنچنا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ ایسی حالت میں کوئی شریف آدمی اس قسم کی ملازمت کیسے گوارا کر سکتا ہے۔"

"کیوں اب کہیں جانا ہے۔" شہناز نے کہا۔ "کچھ نہیں معلوم۔۔۔ بس حکم ملا ہے۔"

"واہ یہ اچھی رہی۔" شہناز نے کہا اور پھر کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ حمید سمجھ رہا تھا کہ شہناز یہ سُن کر کہ ابھی اسے پھر چیف انسپکٹر کے یہاں جانا ہے چلی جائے گی اور وہ اطمینان سے آج رات کے پروگرام پر غور کرے گا۔ لیکن شہناز

ٹس سے مس نہ ہوئی۔ حمید کو اختلاج ہونے لگا۔ آخر کس طرح اس سے چھٹکارا حاصل کرے۔ اگر اسے ذرا سا بھی شُبہ ہو گیا کہ وہ پھر دلاور خاں کے چکّر میں جا رہا ہے تو وہ اس کا ناطقہ بند کر دے گی۔ شہناز کی زبردستیوں پر اکثر اسے غصّہ آنے لگا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ فریدی واقعی بڑا عقلمند ہے جب محبوب کے ہاتھوں یہ حال ہو جاتا ہے تو بیوی کتنی خطرناک ثابت ہوتی ہو گی۔

"ارے بھئی ذرا جلدی کھانا تیّار کرو۔" حمید نے نوکر کو آواز دے کر کہا۔ "مجھے جلد ہی جانا ہو گا۔"

"ایسی بھی کیا جلدی۔" شہناز بولی۔ "ڈیوٹی تو پوری ہی کر آئے ہیں اب ذرا دیر ہی سہی۔"

"ہم لوگ چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔" حمید نے کہا۔

"سب کہنے کی باتیں ہی۔"

"نہیں کرنے کی باتیں ہیں۔"

”آپ سے زیادہ ڈرپوک آدمی میں نے آج تک دیکھا ہی نہیں۔“ شہناز طنزیہ لہجہ میں بولی۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم نے اپنی اتنی عمر مُفت ضائع کی۔“ حمید نے کہا۔

”کیوں۔۔۔؟“

”اس لیے کہ تم نے اب تک کوئی ڈرپوک آدمی نہیں دیکھا۔“

”دیکھ تو رہی ہوں۔“

اتنے میں کھانا آگیا۔ دونوں نے کھانا کھانے کے بعد پھر لڑنا شروع کر دیا۔

”اچھا بھئی۔۔۔ اب چلنا چاہیے۔“ حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”چلو تم کو تمہارے گھر چھوڑ کر میں چیف کے یہاں چلا جاؤں گا۔ آج گاڑی بن گئی ہے۔“

حمید نے کار نکالی اور شہناز کو لے کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے گھر چھوڑ کر وہ یونہی بلا مقصد بڑی دیر تک سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ تقریباً آٹھ بجے وہ گھر لوٹا اور سیدھا ڈریسنگ روم میں گھُس گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ وہاں سے

نکلا تو بر آمدے کی روشنی کر کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا نوکروں کی نظروں سے بچتا ہوا سڑک پر آگیا۔ وہ اسی دوپہر والے مارواڑی سیٹھ کے بھیس میں تھا۔ تھوڑی دور پیدل جانے کے بعد اس نے ٹیکسی کی اور ناولٹی جا پہنچا۔ حسبِ دستور یہاں کافی چہل پہل تھی۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن دلاور خاں کہیں نہ دکھائی دیا۔ منیجر نے اُسے دور ہی سے سلام کیا۔ حمید دانت نکال کر سلام کا جواب دیتے ہوئے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں ہال میں نصب کیے ہوئے اس عورت کے بت پر پڑیں جس کے جسم کے گرد آج دوسری ساری لپیٹی گئی تھی۔ یہاں یہ بت بھی عجیب و غریب چیز تھا۔ دور سے بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سچ مچ کوئی انتہائی حسین عورت کھڑی ہو۔ روزانہ اس کے کپڑے تبدیل کر دیے جاتے تھے۔ بُت ایک چار پانچ فٹ کے دائرہ نما چبوترے پر نصب تھا۔ حمید دیر تک اُسے گھورتا رہا۔ اس نے بیرے سے بیئر لانے کو کہا اور اونگھنے لگا۔

ابھی بیرا واپس نہیں آیا تھا کہ اسے کل والا وہی قوّی ہیکل آدمی دکھائی دیا جو کل

دلاور خاں کے ہاتھ پِٹ گیا تھا۔ وہ سیدھا اُسی کی طرف آ رہا تھا۔ حمید نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا اندازہ تو اس نے کل ہی لگا لیا تھا کہ وہ بھی کوئی بدمعاش ہے۔ اس نے قریب آ کر مؤدبانہ انداز میں حمید کو سلام کیا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"کیوں سیٹھ جی آج کیا بات ہے۔ بہت کھوئے کھوئے نظر آ رہے ہو۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔!" حمید نے مُسکرا کر کہا اور کھانسنے لگا۔ "کیا بتاؤں سخت زکام ہم کو ہو گیا ہے۔"

"یہ تو آپ کی آواز ہی بتا رہی ہے۔" وہ بولا۔ "موسم ہی ایسا ہے۔"

"موسم سالا حرامی ہے۔" حمید نے کہا۔ "آج اسی لیے بیئر پی رہا ہوں، تم کیا پیو گے۔"

"جو پلا دے میرا سیٹھ۔"

"تم اسکاچ پیو۔۔۔!"

اس آدمی نے دانت نکال دیئے۔

اس کا تو حمید نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ آدمی مارواڑی سیٹھ سے کافی بے تکلّف معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے احتیاط سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔
"ارے بیرا ایک بڑا اسکاچ اور سوڈا بھی لاؤ۔"

بیرا جلد ہی اسکاچ اور سوڈا لے آیا۔ دونوں پینے لگے، آج حمید جی کڑا کر کے زندگی میں پہلی بار پی رہا تھا۔

"کیوں سیٹھ آج کھیل نہ ہو گا۔" وہ آدمی اس کاچ کی چسکی لے کر بولا۔

"نہیں بھائی، آج طبیعت ٹھیک نہیں۔"

"آج ایک بڑی عمدہ چیز آئی ہے۔" وہ آدمی بولا۔ "میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔"

"اچھا۔۔۔!" حمید مُسکرا کر معنی خیز انداز میں بولا۔ "اب وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔"

”ہاں سیٹھ۔۔۔بس سمجھ لو پکا آم ہے۔“

حمید ندیدوں کی طرح ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ دونوں نے جلدی جلدی شراب ختم کی۔

”آؤ چلیں۔۔۔!“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

حمید اس کے پیچھے ہو لیا۔ ہال سے گذر کر انہیں کئی اور کمروں اور گلیاروں سے گزرنا پڑا۔ ایک کمرے میں پہنچ کر اس آدمی نے ایک الماری سے ربڑ کا توبڑا نکالا اور حمید کو پکڑا دیا۔ حمید سخت حیرت میں تھا کہ آخر اس کا کیا مطلب ہے۔

”کیا سوچ رہے ہو سیٹھ۔“ وہ حمید کو شش و پنج میں دیکھ کر بولا۔

دفعتاً ایک خیال بجلی کی طرح حمید کے ذہن میں کوند گیا۔ ”روز روز وہی پٹی، آخر تم ہمارا اعتبار کیوں نہیں کرتا۔“ حمید نے وہ توبڑا اپنی آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ توبڑا اس کی آنکھوں پر اس طرح فٹ ہو گیا کہ روشنی کی ہلکی سی لکیر بھی اسے نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اب اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر چلنے لگا۔ وہ

اندھوں کی طرح اس کے ساتھ جارہا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ توبڑے کو ذراسا کھسکا کر کم از کم راستہ ہی دیکھ لے لیکن ہمّت نہ پڑی اور اگر ہمّت پڑ بھی جاتی تو وہ ایسا کر ہی کیسے سکتا تھا جبکہ اس آدمی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ رکھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی زینہ سے نیچے اتر رہا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ اب وہ کسی تہہ خانہ میں جارہا ہے۔ زینہ طے کرنے کے بعد اسے تھوڑی دور اور اسی طرح چلنا پڑا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے گئے۔ اس نے جلدی سے توبڑا اتار کر اپنے ساتھی کو پکڑا دیا۔

اس وقت وہ ایک بہت لمبے چوڑے تہہ خانہ میں تھا جہاں بے شمار میزیں اور کرسیاں پڑی تھیں اور لوگ بیٹھے جوا کھیل رہے تھے۔ ایک طرف کچھ لوگ زمین پر اوندھے پڑے چانڈو پی رہے تھے۔ حمید کا ساتھی اسے اپنے ساتھ لئے ہوئے ایک کمرے میں آیا۔ یہاں ایک عورت نیم عریاں حالت میں بیٹھی شراب پی رہی تھی۔ حمید اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ شہر کے مشہور لکھ پتی کی نوجوان بیوی تھی۔

”کیا تمہیں اس گندے مارواڑی کے علاوہ کوئی اور نہیں ملا۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر تیز لہجہ میں بولی۔ ”دور ہو جاؤ یہاں سے۔“

”سنئے تو سہی۔“ وہ بولا۔

”میں کچھ نہیں سنتی، تم اچھے خاصے گدھے ہو۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”نکالو اسے یہاں سے۔۔۔ اگر کوئی اور نہیں تو تم خود کسی سے کم ہو۔“ حمید کا ساتھی اسے پھر بڑے کمرے میں لے آیا جہاں لوگ جوا کھیل رہے تھے۔

”سیٹھ تم یہاں بیٹھو، میں ابھی آیا، پھر دو دو ہاتھ ہوں گے۔“ اس نے کہا اور اسی کمرے میں واپس چلا گیا۔

اب حمید کی سمجھ میں اچھی طرح آ گیا تھا کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دفعتاً وہ چونک پڑا۔ ایک میز پر دلاور خاں بھی جوا کھیل رہا تھا۔ ایک طرف آدھی بوتل شراب اور گلاس رکھے تھے۔ ہونٹوں میں موٹا سا سگار دبا ہوا تھا۔ حمید نے پھر ایک بیرے کو بلا کر بیئر کا آرڈر دیا۔ وہ اس میز پر

بالکل تنہا تھا۔ جیسے ہی بیرا شراب لے کر آیا کسی طرف سے دو آدمی اور آکر میز پر بیٹھ گئے۔

"کیوں سیٹھ کیا ارادہ ہے۔" ایک نے کہا۔ "کیا آج کھیلو گے نہیں۔"

"ہو گا کھیل۔۔۔ مگر زیادہ لمبا نہیں۔" حمید نے اپنے مصنوعی غلیظ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"آؤ تو ہو جائے۔" دوسرا بولا۔

اتنے میں وہ شخص بھی آگیا جو حمید کو اپنے ساتھ لایا تھا۔

"کہو اُستاد کیسی رہی۔۔۔!" وہ کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا بیٹھ گیا۔

"چیز تو بڑھیا ہے۔" حمید نے پھوہڑ پنے کے ساتھ کہا۔

"ہو گی پر اپنے کام کی نہیں۔" وہ بولا۔

پتے بانٹ دیئے گئے اور وہ چاروں بھی کھیلنے لگے۔ حمید برابر ہارے جا رہا تھا۔ اس

نے محسوس کر لیا کہ پتے لگائے جا رہے ہیں اس لیے اس نے احتیاط سے کھیلنا شروع کر دیا۔ وہ برابر پتے پھینکتا جا رہا تھا۔ ”آج چال نہیں چل رہے ہو۔ سیٹھ کیا بات ہے۔“ ایک بولا۔

”آج پیشہ کم ہے۔“ حمید نے کہا۔

”ارے تم اس کی پرواہ کیوں کرتے ہو۔ ادھار لے لو۔ اپنے ہی آدمی ہو کوئی غیر نہیں۔“

دفعتاً ایک دھماکہ کی آواز سنائی دی۔ سب چونک پڑے۔ دلاور خاں نے میز اُلٹ دی تھی اور اب کھڑا ہاتھ میں خالی بوتل لیے ہوئے تول رہا تھا۔ اس کے ساتھ کے تینوں کھلاڑی زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

”پتّے لگاتے ہو۔“ وہ گرج کر بولا۔

پھر ایک ریوالور چلنے کی آواز سُنائی دی۔ لوگ اس طرف متوجّہ ہو گئے۔ ایک قد آور آدمی جس نے اپنا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا رکھا تھا ایک ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔

سارے تہہ خانہ میں سنّاٹا چھا گیا۔ کھیل بند ہو گیا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ دم بخود کھڑے تھے۔ نقاب پوش آہستہ آہستہ چلتا ہوا دلاور کے قریب آیا اور اس کے ہاتھ سے خالی بوتل چھین کر ایک طرف ڈال دی۔

دلاور خاں چُپ چاپ کھڑا تھا۔

"کون ہو تم۔۔۔!" نقاب پوش گرج کر بولا۔

دلاور خاں چپ چاپ کھڑا رہا۔

"اسے یہاں کون لایا ہے۔" نقاب پوش مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں۔۔۔!" حمید کا ساتھی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "یہ وہی ہے جس سے کل لڑائی ہوئی تھی۔"

"اچھا تو یہ وہی ذات شریف ہیں۔" نقاب پوش دلاور کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

دلاور خاں مُسکرانے لگا۔

"تم نے یہاں ہڑبونگ کیوں مچائی۔" دلاور خاں نے پُرسکون لہجہ میں کہا۔

"بکواس ہے۔" نقاب پوش نے کہا۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے۔"

"یہ دوہرے تاش۔۔۔!" دلاور اسے تاش کی دو گڈیاں دکھاتے ہوئے بولا۔ "شریفوں کی جیب پر ڈاکہ ڈالو تو ایک بات بھی ہے ہم جیسے تو تم جیسوں کے لیے جیب میں ریوالور بھی موجود رکھتے ہیں۔"

"بڑے تیس مار خاں ہو!" نقاب پوش طنزیہ لہجہ میں بولا۔

"میں تیس دونا ساٹھ مار خاں ہوں بیٹا۔" دلاور خاں سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

نقاب پوش نے دلاور خاں کے منہ پر ایک گھونسہ مار دیا، دلاور لڑکھڑا گیا۔ شاید وہ اس کے لیے تیّار نہ تھا۔ وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ نقاب پوش نے دوسرا گھونسہ مارا۔ پھر تیسرا اور پھر اس نے گھونسوں کی بوچھاڑ کر دی۔ دلاور خاموشی سے پِٹ رہا

تھا۔ تھوڑی دیر بعد نقاب پوش ہانپنے لگا۔

"اچھا اب ایک میرا بھی سنبھالو۔" دلاور نے اسے سُست ہوتا دیکھ کر کہا۔ دلاور کا ہاتھ پڑتے ہی نقاب پوش ڈھیر ہو گیا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اب کی دلاور نے اُس کی ٹھوڑی پر ایک لات رسید کی، نقاب پوش بلبلا اُٹھا۔ یہ دیکھ کر حمید کے ساتھی نے پستول نکال لیا، نہ جانے کس اچانک خیال کے تحت حمید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُوپر اٹھا دیا، گولی چل چکی تھی۔ بجلی کا بلب نشانہ ہو گیا اور سارے قحبہ خانہ میں اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگ اِدھر اُدھر ایک دوسرے سے ٹکراتے پھر رہے تھے۔ کسی نے حمید کی کنپٹی پر ایک گھونسہ رسید کیا، وہ چکرا کر گرنے لگا۔ فوراً کسی نے اسے سنبھال لیا اور اپنی پیٹھ پر لاد کر لے بھاگا۔ وہ اُوپر چڑھ رہا تھا۔ اُوپر سیڑھی پر پہنچ کر اس نے حمید کو اتار دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف آہستہ آہستہ رینگنے لگا۔

"چپ چاپ چلے آؤ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ حمید کا سر چھت سے ٹکرا رہا تھا۔

دونوں نے چھت ٹٹولنا شروع کی لیکن باہر جانے کا کوئی راستہ نہ ملا۔ چھت سے تقریباً ایک فٹ نیچے حمید کو چھت اور دیوار کے درمیان اتنی جگہ محسوس ہوئی جس میں ایک آدمی لیٹ کر باآسانی رینگ سکتا تھا۔ غالباً اس کے ساتھی نے بھی اسے محسوس کر لیا تھا۔

"ادھر چڑھ چلو۔۔۔!" اس نے آہستہ سے کہا۔

دونوں اس دراز میں لمبے لمبے لیٹ گئے۔

"اب یہاں لیٹ کر کسی آنے والے کا انتظار کرنا چاہیے، یہاں دروازہ ضرور ہو گا ورنہ زینوں کی کیا ضرورت تھی۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"مگر اس طرح ہم لوگ دیکھ لیے جائیں گے۔" حمید نے کہا۔

"اچھا تو آگے کی طرف کھسکنا شروع کرو، دیکھیں ادھر کیا ہے۔" وہ بولا۔ دونوں لیٹے ہی لیٹے رینگنے لگے۔ تھوڑی دور سرکنے کے بعد حمید نے عجیب قسم کی بدبُو محسوس کی اور ساتھ ہی پانی بہنے کی ہلکی ہلکی آواز سُنائی دینے لگی۔ دلاور آگے تھا۔

دفعتاً وہ رُک گیا۔ اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکال کر روشن کی۔ آگے دو فٹ چوڑا اور تقریباً چار فٹ لمبا ایک گڑھا تھا۔ حمید اپنے ساتھی کو بغور دیکھ رہا تھا۔

”نیچے کوئی گندہ تالاب بہہ رہا ہے۔“ اس نے حمید کی طرف مُڑ کر کہا۔ ”مگر بدبُو بہت سخت ہے۔ اب چلو ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ ہم لوگ اس میں کود پڑیں کہیں نہ کہیں تو جا کر نکلیں گے۔“

”اور اگر کبھی یہ نالا آگے چل کر نالی ہو گیا تو کیا ہو گا۔“ حمید بولا۔

”اچھا، اور اگر یہاں پکڑے گئے تو کیسی خاطر ہو گی۔ یہ بھی سوچ لو۔ میری جان بچانے کے صلہ میں وہ تمہیں کافی کڑی سزا دیں گے۔ میرے خیال میں تو اس نالے میں گھٹ کر مر جانا کوئی اچھا نہ ہو گا۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔۔۔!“ حمید نے بے بسی سے کہا۔

”اچھا تو پہلے میں کودتا ہوں۔“ یہ کہہ کر دلاور اس گڑھے میں اتر گیا۔ نیچے سے

اس نے ٹارچ دکھائی اور حمید بھی کود پڑا۔ تقریباً چار پانچ فٹ چوڑا قد آدم نالا تھا۔ سارے شہر کا گندا پانی اس میں بہا کرتا تھا۔ حمید نے اپنی ناک مضبوطی سے دبا رکھی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ پانی حمید کی کمر تک تھا۔

"میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔" حمید نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں۔۔۔ یہ نالا ہرگز نالی نہیں ہو سکتا ہے۔"

"لیکن ہم کب تک اس طرح چلتے رہیں گے۔ باہر نکلنے کی کیا صورت ہو گی۔" حمید نے کہا۔

"تم نے سڑکوں پر بعض جگہ لوہے کی جھنجھریاں لگی ہوئی دیکھی ہوں گی۔ ان کا تعلق نالے سے ہے۔ گھبراؤ نہیں۔" تھوڑی دیر چلنے کے بعد پانی کی سطح پر روشنی کے کئی لہریئے دکھائی دیئے۔

"چلو جھنجھری بھی آگئی۔" حمید نے کہا۔

"پاگل ہوئے ہو، اس جگہ کافی آمد و رفت معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہاں اوپر نکلے تو

اچھی خاصی حجامت بن جائے گی۔ تم تو خیر بچ ہی جاؤ گے لیکن میرے سلسلہ میں کافی چھان بین کی جائے گی اور نتیجہ یہ ہو گا کہ میں جیل میں نظر آؤں گا۔"

"حمید میاں، تم مارواڑی کے بھیس میں مجھ سے نہ چھپ سکو گے۔" دلاور خاں ہنس کر بولا۔ "خیر چلو۔۔۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اگر آج تم میرے پیچھے نہ لگتے تو میں دوسری دنیا میں ہوتا۔"

"کیا واقعی تمہارا تعلّق ان لوگوں سے نہیں۔" حمید نے کہا۔

"ہر گز نہیں۔۔۔ میں ان لوگوں سے بدلہ لیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔"

"آخر یہ لوگ ہیں کون۔" حمید نے پوچھا۔ "اور وہ نقاب پوش کون تھا۔"

"ناولٹی کا مالک سنتوش۔۔۔!" دلاور نے کہا۔ "یہ لوگ صرف یہیں تک محدود نہیں، انہوں نے اپنا جال دور دور تک پھیلا رکھا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو کل ہی۔"

”جی ہاں کل ہی آپ انہیں گرفتار کرلیں گے۔“ دلاور نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ان کے خلاف ثبوت کیسے مہیّا کروگے۔“

”تہہ خانہ اور اس کی غیر قانونی حرکتیں۔“حمید نے کہا۔

”تو کیا تم اس تہہ خانہ میں دوبارہ پہنچ جانے کی اُمّید رکھتے ہو۔“ دلاور نے کہا۔ ”کیا تمہاری آنکھوں پر پٹّی نہیں باندھی گئی تھی۔“

”ہم لوگ اسی نالے کی راہ سے حملہ کریں گے۔“حمید نے کہا۔

”بہت خوب۔۔۔!“ دلاور نے ہنس کر کہا۔ ”وہ گڑھا اسی وقت پاٹ دیا جائے گا اور کل تمہیں اس کا نشان تک نہ ملے گا۔“

”خیر چھوڑو۔۔۔!“حمید نے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم نے فریدی صاحب کو کیوں گرفتار کررکھا ہے۔“

”فریدی کو آج چھوڑ دیا ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”کیا وہ گھر نہیں پہنچا۔“

”نہیں۔۔۔!“حمید نے کہا۔

”تو پھر مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ سنتوش کے ہتھّے نہ چڑھ گیا ہو۔“

”نہیں۔۔۔!“حمید نے کہا۔

”میری تو خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اب کیا ہو رہا ہے۔“حمید نے بے بسی سے کہا۔

”چیز ہی ایسی ہے کہ اسے سیٹھ اگروال، فریدی، سنتوش اور میرے علاوہ کوئی اور جان بھی نہیں سکتا۔“

”اچھا تم نے فریدی کی تجوری سے کیا چیز غائب کی تھی۔“حمید نے کہا۔

”یہی تو ہمارا راز ہے، جو بتایا نہیں جا سکتا۔“ دلاور نے کہا۔”آخر فریدی نے تم سے کیوں چھپایا تھا۔“

”یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔“حمید نے کہا۔”اچھا دیکھو وہ روشنی دکھائی دے رہی

ہے۔ یہ جگہ سنسان معلوم ہوتی ہے۔" دلاور نے کہا۔

حمید نے اُوپر سر اٹھا کر دیکھا۔ جھنجھری سے دُھندلی دُھندلی روشنی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک کا یہ حصّہ کافی ویران معلوم ہوتا تھا۔ حمید نے دونوں ہاتھ اٹھا کر جھنجھری میں ٹکا دیے اور زور لگانے لگا لیکن جھنجھری میں جنبش بھی نہ ہوئی۔ دلاور ہنسنے لگا۔ اس نے حمید کو ایک طرف ہٹا دیا۔

چند منٹوں کی جدوجہد کے بعد وہ جھنجھری کو اس کی جگہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں اچھل کر باہر آئے۔ جھنجھری پھر وہیں فٹ کر دی گئی۔ حمید سردی کی وجہ سے بُری طرح کانپ رہا تھا۔ لیکن دلاور پر کوئی خاص اثر نہ معلوم ہوتا تھا۔

"اچھا شکریہ۔" دلاور نے حمید سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "تم نے میری جان بچائی ہے۔"

"اور تم نے میری۔۔۔!" حمید نے کہا۔ "دونوں برابر ہو گئے۔"

"مطلب۔۔۔!" دلاور نے ہنس کر بولا۔

”یہی کہ اگر آسانی سے کبھی میرے ہتھّے چڑھ گئے تو چھوڑوں گا نہیں۔“حمید نے کہا۔

”لونڈے ہو حمید میاں، چالیس سال سے آزاد پھر رہا ہوں ابھی تک تو کوئی مائی کا لال ایسا پیدا نہیں ہوا جو مُجھے پکڑ سکے۔“

”خیر دیکھا جائے گا۔“حمید بولا۔”اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔“

ہینڈز اپ

حمید نے دوسرے دِن ساری روئیداد چیف انسپکٹر کو سنائی۔ وہ سنّاٹے میں آگیا۔

"واقعی فریدی کی صحبت نے تم پر گہرا اثر ڈالا ہے۔" چیف نے کہا۔ "اس وقت کوئی انسپکٹر بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔"

"اور مجھے حیرت ہے کہ آخر فریدی تمہاری ترقّی کی راہ میں رکاوٹیں کیوں ڈالتا

رہتا ہے۔"

"دراصل وہ یہ نہیں چاہتے کہ میں اُن سے الگ رہوں۔" حمید نے کہا۔

"اچھی سنک ہے۔" چیف نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے دلاور خاں کو کیوں نکل جانے دیا۔"

"اس وقت میں کر ہی کیا سکتا تھا۔"

"دیکھو یہ بہت اچھا موقع ہے۔ جب دو بدمعاشوں میں کھٹ پٹ ہو جائے تو ہمیں اس کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ غالباً تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ بہت اچھی طرح۔"

"تو آج رات کو ہم لوگ ناولٹی چل رہے ہیں۔" چیف نے کہا۔ "تہہ خانہ میں پہنچنا تو اب کافی محال ہے کیونکہ وہ لوگ اب کافی محتاط ہو گئے ہوں گے۔"

"یہ تو ہے۔"

”جب تک ہمارے پاس مکمل ثبوت نہ ہو ہم ان لوگوں کو گرفتار نہیں کر سکتے۔“ چیف نے کہا۔ ”دلاور خاں پر بھی کسی نہ کسی طرح ہاتھ پڑنا ہی چاہیے۔“

”محال ہے۔“

”کیوں۔۔۔۔؟“

”بہت چالاک آدمی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”مُجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ وہ اس طرح آزادانہ کس طرح گھومتا پھرتا ہے۔“

”یہاں اسے کوئی پہچانتا نہیں۔“ چیف نے کہا۔

”ایک صورت سے ہمیں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔“حمید نے کہا۔

”وہ کیسے؟“

”فی الحال ہم لوگ اسے اپنے ساتھ ملالیں وہ بھی ان لوگوں کا جانی دُشمن ہو رہا ہے۔“حمید نے کہا۔

"لیکن یہ ہو گا کیسے۔۔۔!" چیف نے کہا۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔"

☆☆☆☆☆

اسی دِن ناولٹی ہوٹل کے ایک کمرے میں دلاور بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ یہ ایک بہترین طرز پر سجایا ہوا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دلاور نے طویل انگڑائی لیتے ہوئے گھڑی دیکھی اور سگار سلگا کر ہونٹوں میں دباتے ہوئے صوفے کے تکیہ سے لگ گیا۔ دفعتاً ایک آدمی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ دلاور نے پلٹ کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ آنے والا کچھ دیر تک اس کے پیچھے کھڑا اسے گھورتا رہا۔

"فرمایئے کیسے تکلیف کی۔ میرے لائق کوئی خدمت۔۔۔!" وہ آدمی بولا۔ دلاور خاں ایک خاص انداز میں مُسکرا کر پلٹا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"غالباً میں سنتوش بابو سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔" دلاور نے

اٹھتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھیئے۔" سنتوش نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "فرمایئے۔"

"تکلّف برطرف۔" دلاور تیز لہجہ میں بولا۔ "میں اپنے کل رات کو ہارے ہوئے روپے واپس لینے آیا ہوں۔"

"ہارے ہوئے روپے!" سنتوش نے متحیّر ہو کر کہا۔ "شاید آپ بھول رہے ہیں۔ ہمارے یہاں جوا نہیں ہوتا۔ آپ کہیں اور ہارے ہوں گے۔"

"اور آپ کا دانت بھی کہیں اور ٹوٹا ہو گا۔" دلاور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور آپ کی ٹھوڑی پر ٹھوکر بھی کہیں اور پڑی ہو گی۔"

"آپ نہ جانے کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" سنتوش نے کہا۔ "شاید آپ زیادہ پی گئے ہیں۔"

"ممکن ہے۔" دلاور نے کہا۔ "لیکن اتنا یاد رکھنا کہ دلاور خاں پشاوری سے ٹکّر لینا آسان کام نہیں۔" دلاور نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

سنتوش آنکھیں پھاڑتے ہوئے اُسے گھور رہا تھا۔

”تو استاد پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا تھا۔“ سنتوش نے آہستہ سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔

”تم نے پوچھا کب تھا۔۔۔!“ دلاور نے لاپروائی سے کہا۔

”تو آپ اِدھر کب آئے۔“

”حال ہی میں آیا ہوں اور تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں سیٹھ اگروال کے لیے کام کر رہا ہوں۔“

”سمجھا۔۔۔ لیکن آپ کو اس سے کیا فائدہ ہو گا، جب کہ میرے علاوہ اور کوئی دوسرا اس چیز کے راز سے واقف نہیں۔“

”تو وہ چیز تمہی نے اڑائی تھی۔“

”نہیں۔۔۔ مجھ سے پہلے ہی کوئی اُڑا لے گیا اور اسی رات کو جب میں نے بھی اس

کے لیے کوشش کی تھی۔"

"اور پھر تم نے اسی جھلّاہٹ میں اگروال پر گولی چلادی۔"

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔" سنتوش بے ساختہ بولا۔

"مجھ سے اس شہر کے کسی بدمعاش کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ چیز کون لے گیا۔"

"ابھی تو نہیں لیکن میں اس کا پتہ جلد لگالوں گا۔"

"آپ وہ چیز اس سے حاصل کر کے سیٹھ اگروال کو دے دیں گے۔"

"ہاں۔۔۔!"

"اگر آپ اس چیز کے راز کو جانتے ہوتے تو کبھی ایسی بات نہ کہتے۔" سنتوش نے کہا۔ "خیر سیٹھ اگروال اسے دوبارہ پا جانے پر بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔"

"میں اسے سمجھ سکتا ہوں لیکن مجھے اس سے کیا۔ میں اسے اس کے حوالے کر

کے اس سے مناسب معاوضہ وصول کر لوں گا۔"

"کوئی اس کی قیمت لگا ہی نہیں سکتا۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں۔" دلاور نے کہا۔

"اگر آپ یہ بھی جانتے ہیں تو پھر اسے حاصل کر کے میرے حوالے کر دیجئے۔"

"آدھے آدھے کی رہی۔"

"چلو منظور۔" دلاور نے کہا۔ "لیکن پہلے مجھے وہ تعویذ دکھا دو۔"

"ارے۔۔۔!" سنتوش چونک کر بولا۔ "تو کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں۔"

"میں کیا نہیں جانتا۔" دلاور بولا۔ "لاؤ اسے جلدی لاؤ، ورنہ سب معاملہ عنقریب گڑبڑ ہو جائے گا۔"

سنتوش کچھ سوچنے لگا۔

"میں جانتا ہوں کہ پٹھان بات کے پکّے ہوتے ہیں۔" سنتوش نے کہا۔ "میں آپ

کو وہ تعویذ دکھادوں لیکن میرے ساتھ دغا نہ کیجئے گا۔"

"دغا تو میں سیٹھ اگروال کے ساتھ بھی نہ کروں گا۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" سنتوش چونک کر بولا۔

"یہی کہ میں نے اس چیز کی واپسی کا وعدہ کیا ہے، وہ چیز اسے واپس کی جائے گی۔ یہ اور بات ہے کہ گودا ہمارا ہو اور چھلکا اُس کا۔"

سنتوش نے قہقہہ لگایا۔

"مانتا ہوں استاد۔۔۔!" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور باہر جانے لگا۔

"ٹھہرو۔۔۔!" دلاور نے کہا۔ "یہ بھی سُن لو کہ میں صرف ایمانداروں کے ساتھ ایمانداری برت سکتا ہوں۔"

"اس سے آپ مطمئن رہیے۔ میری بات بھی پکّی ہوتی ہے۔"

سنتوش چلا گیا۔ دلاور نے بجھا ہوا سگار سلگایا اور آنکھیں بند کر کے صوفہ پر نیم

دراز ہو گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سنتوش لوٹا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کی ایک تھیلی تھی۔

"یہ لیجئے۔" سنتوش نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

دلاور نے تھیلی کھول کر اس میں سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور اسے بغور دیکھتا رہا۔

پھر سنتوش کو واپس کرتے ہوئے بولا۔ "میرے خیال سے اسے جلا دو۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"اس لیے کہ جو شخص وہ چیز اگروال کے یہاں سے لے گیا ہے وہ اس کی فکر میں بھی ہو گا۔"

"ارے تو اب ایسا کوئی نہیں کہ سنتوش کے قبضہ سے اُسے نکال لے جائے۔" سنتوش نے اکڑ کر کہا۔

”کرنے لگے وہی بچپنے کی باتیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”فرض کرو کہ میں نے ہی اس چیز کو چُرا لیا ہو اور اس وقت میں نے تمہیں دھوکہ دے کر اس کی دوسری کڑی بھی معلوم کر لی۔“

سنتوش نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

”اچھا میں آپ کے کہنے پر عمل کروں گا۔“ سنتوش نے کہا۔

”تو اب میں چلتا ہوں، رات کو کسی وقت آؤں گا اور ہاں ذرا ہوشیار رہنا۔ یہاں کے جاسوس کی تم پر کڑی نظر ہے۔ کل تو ایک تمہارے تہہ خانہ میں بھی پہنچ گیا تھا۔“ دلاور نے کہا۔

”مجھے سب معلوم ہے۔ تہہ خانہ کا راستہ ان کے باپ کو بھی نہیں معلوم ہو سکتا اور یہاں اوپر کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بناء پر وہ مجھے ہاتھ لگا سکیں، ان سے تو میں اچھی طرح نپٹ لوں گا۔“

دلاور سنتوش سے ہاتھ ملا کر باہر چلا آیا۔

☆☆☆☆☆

اسی رات کو حمید اور چیف ناولٹی ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ چیف کا بنگلا شہر کے باہر واقع تھا۔ اس لیے شہر جانے کے لیے انہیں سڑک کا ایک بہت بڑا ویران حصّہ طے کرنا پڑتا تھا۔ رات کو تقریباً آٹھ بجے تھے۔ ٹیکسی کی روشنی تاریک رات کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ بھی عجیب اتّفاق تھا کہ آج انہیں ایک ٹیکسی اس غیر آباد علاقہ میں مل گئی، ورنہ انہیں پیدل ہی آنا پڑتا۔ فریدی کی کار جو حمید کے استعمال میں رہتی تھی وہ آج پھر خراب ہو گئی تھی۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں بیچ سڑک پر ایک آدمی ہاتھ اٹھائے ہوئے کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے چیسٹر کے کالر کھڑے کر رکھے تھے اور نائٹ کیپ آگے کی طرف اس طرح جھکا رکھی تھی کہ چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

ڈرائیور نے اس کے قریب پہنچ کر ٹیکسی روک دی۔ وہ شخص کھڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

”ہینڈز اپ۔۔۔!“ اس نے ریوالور نکال کر ٹیکسی کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔ ”تم دونوں نیچے اتر آؤ۔۔۔“ پُراسرار اجنبی نے حمید اور چیف انسپکٹر سے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔ دونوں خاموشی سے ہاتھ اٹھائے ہوئے نیچے اتر آئے۔

”جاؤ بیٹا۔“ پُراسرار اجنبی نے ڈرائیور سے کہا۔ ”اپنے استاد سے کہہ دینا کہ میرے شکار پر ہاتھ نہ ڈالا کرے ورنہ اچھا نہ ہوگا۔“

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اجنبی نے دو تین ہوائی فائر کیے اور ٹیکسی نظروں سے غائب ہوگئی۔ اب وہ اجنبی ان دونوں سے مخاطب ہوا۔

”ناولٹی ہوٹل اچھی جگہ نہیں۔۔۔ خصوصاً شرفاء کے لیے۔“ اس نے کہا۔

”تم کون ہو۔“ حمید گرج کر بولا۔ ”خیریت اس میں ہے کہ ریوالور جیب میں رکھ لو۔“

”ناراض ہونے کی ضرورت نہیں سرکار۔۔۔ یہ لیجئے۔“ اجنبی نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

”آخر تم ہو کون۔۔۔؟“ چیف نے پوچھا۔

”دوست۔“ یہ کہہ کر اجنبی نے سگریٹ سلگانے کی دیا سلائی جلائی اور حمید کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”فریدی صاحب۔۔۔؟“

”فریدی۔۔۔!“ چیف نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیا۔۔۔؟“

”بس چپ چاپ گھر کی طرف چلے چلئے۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچ جاتا تو آپ لوگ گئے تھے ہاتھ سے۔“

وہ تینوں واپس جانے کے لیے مڑے۔

”آخر بات کیا ہے۔“

”اس سنسان راستہ پر کبھی اور بھی آپ کو کوئی ٹیکسی ملتی تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”نہیں۔۔۔ لیکن اس سے کیا بحث۔“

”یہی تو خاص چیز ہے۔ آپ لوگوں کو غائب کرانے کا پروگرام بنایا گیا تھا، بدمعاشوں کو کسی طرح اطلاع مل گئی تھی کہ آج آپ لوگ ناولٹی میں آنے والے ہیں۔ اس لیے انہوں نے پہلے ہی سے آپ کی سواری کا انتظام کر دیا تھا۔“

”تمہیں ان سب باتوں کی اطلاع کیسے ہوئی۔“ چیف نے کہا۔

”ظاہر ہے کہ میں اتنے دِنوں تک محض جھک نہیں مار رہا تھا۔“

”وہ کچھ سہی۔۔۔ لیکن تم کسی نہ کسی دِن اپنی جان خطرے میں ضرور ڈال لوگے۔ آخر اس طرح کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”اپنا اپنا طریقہ کار ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے خطروں سے کتنا پیار ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”مگر مجھے تمہارا یہ طریقہ پسند نہیں۔“ چیف نے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے محبّت کرتے ہیں۔ لیکن کیا کروں میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں، بعض کیس ہی ایسے ہوتے ہیں کہ مجھے تنہا کام کرنے پر

مجبور ہونا پڑتا ہے۔"

"خیر بھئی۔۔۔ تم جانو، سمجھانا میرا کام ہے۔" چیف نے کہا۔ "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے اس ڈرائیور کو یونہی کیوں نکل جانے دیا۔"

"ابھی فی الحال اسے گرفتار کرلینا ٹھیک نہیں تھا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"میں نے اس وقت اس سے ایک ڈاکو کی حیثیت سے بات کی تھی۔" فریدی نے کہا۔ "معاملات حد درجہ دلچسپ ہو گئے ہیں۔ بدمعاشوں کی دو پارٹیوں میں ٹھن گئی ہے۔ ان میں سے ایک پارٹی سنتوش کی ہے اور دوسرے ان لوگوں کی ہے جنہوں نے سیٹھ اگروال کے یہاں ڈاکہ ڈالا تھا۔ جس دِن یہ واردات ہوئی تھی اس دِن سنتوش اور ان کے ساتھیوں نے بھی سیٹھ اگروال کے گھر میں گھُسنے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ لوگ ان دونوں کے بعد آئے تھے اور سنتوش ہی کی گولی سے سیٹھ اگروال زخمی بھی ہوا تھا۔"

”لیکن یہ آج تک میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ ان لوگوں کا مقصد کیا تھا۔“ چیف انسپکٹر نے کہا۔

”یہ تو ابھی تک مجھے بھی نہیں معلوم ہو سکا لیکن سنتوش کو قانون کی زد میں لانے کے لیے میرے پاس بہت سے ثبوت ہیں۔“

”اور ایک دلچسپ بات اور سنو۔۔۔!“ چیف نے کہا۔ ”آج کل دلاور خاں پھر دکھائی دے رہا ہے اور جس وقت تمہارے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا وہ پولیس کی غائب کی ہوئی لاری پر دیکھا گیا تھا۔“

”جی ہاں۔۔۔ وہی تو ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس سے تو مجھے خاص طور پر نپٹنا ہے۔ لیکن ابھی نہیں، سنتوش کی گرفتاری کے بعد اس سے بھی سمجھ لوں گا۔ فی الحال اس سے اُلجھنا نہیں چاہیے، اس میں بھی ایک راز ہے۔“

”بھئی اپنی باتیں تم ہی سمجھو۔۔۔!“ چیف نے اُکتا کر کہا۔ ”پرسوں رات کو نو بجے

کم از کم پچیس جوان سادے لباس میں لے کر ناولٹی پہنچ جایئے گا۔ اور وہاں اگر دلاور سے مُڈ بھیڑ ہو جائے تو اسے فی الحال نظر انداز کرنے کی کوشش کیجئے گا ورنہ سب معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ اچھا تو اب میں چلا۔ اب سنتوش کی گرفتاری کے بعد ہی ملاقات ہو گی۔"

چیف کا بنگلہ قریب تھا۔ فریدی واپس لوٹنے کے لیے مڑا۔

"سنئے تو سہی۔" حمید نے بے قراری سے کہا۔

"نہیں اس وقت نہیں۔۔۔ تمہیں کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔ میرے بتائے ہوئے وقت سے پہلے ناولٹی کے قریب بھی جانے کی ضرورت نہیں۔" فریدی نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔

عجیب و غریب عشق

فریدی کے بتائے ہوئے پلان کو شام ہی سے ایک ایک دو دو کر کے پولیس کے مسلح مگر سادے لباس میں ملبوس جوان ناولٹی میں اڈّہ جمانے لگے۔ فریدی کی ہدایت کے مطابق وقت سے پہلے کسی نے کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے ناولٹی والوں کو ہوشیار ہو جانے کا اشارہ ملتا۔ نو بجے رات تک جوانوں کی مقرّرہ تعداد ناولٹی میں پہنچ گئی۔ چیف اور حمید بھی بھیس بدلے ہوئے وہاں موجود تھے۔

ہر شخص اپنی جگہ پر کسی چیز کا منتظر تھا۔ لیکن کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ اگلے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ چیف اور حمید کی نگاہیں فریدی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن وہ

ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"فریدی تو دکھائی نہیں دے رہا ہے۔" چیف نے آہستہ سے کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" حمید نے کہا۔ "نہ جانے آئندہ ان کی اسکیم کیا ہے۔"

"کہیں مُفت کی سر دردی نہ ہو۔" چیف بولا۔

"یہ ناممکن ہے۔" حمید نے کہا۔ "فریدی بے بنیاد چیزوں پر کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔"

"خیر اب تو آ ہی گئے ہیں، جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"ہاں۔۔۔ دیکھئے۔" حمید نے کہا۔

"یہ بات بھی عجیب و غریب ہے۔" چیف نے کہا۔ "دور سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے سچ مچ کوئی عورت کھڑی ہو۔"

”عجیب قسم کا رنگ وروغن ہے اس کے چہرے پر۔“حمید نے کہا۔

ابھی ان دونوں میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دفعتاً کوئی آدمی نہایت بھدّی اور بے ہنگم آواز میں گانے لگا۔ ہر فرد اس کی طرف متوجّہ ہو گیا۔ دلاور خاں نشہ میں دھت ہاتھ میں ایک خالی بوتل لیے لڑکھڑاتا اور گاتا ہوا ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے پر رُک کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور ایک قہقہہ لگا کر پھر گانے لگا۔ وہ اپنی مادری زبان پشتو میں کوئی گیت گا رہا تھا۔

ہوٹل کا منیجر گھبراکر اس کی طرف دوڑا۔ وہ اس سے آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا۔

”میں تو گاؤں گا۔۔۔!“ دلاور خاں چیخ کر بولا۔ ”دیکھتا ہوں میرا کوئی کیا کرتا ہے۔ میں تمہارے مالک سنتوش بابو کا دوست ہوں۔“

”گانے دو بھائی گانے دو۔۔۔!“کئی مدہوش شرابی چیخے۔

”جیو میرے ساتھیو۔۔۔ جیو۔“ دلاور خاں نے جھومتے ہوئے کہا۔ ”ہم ہی جیسوں کے دم سے دنیا قائم ہے ورنہ کبھی کب کی قیامت آگئی ہوتی۔“ چند

شرابیوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

"میرے پیارے بھائیو۔۔۔!" دلاور خاں بُت کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "میں اِس عورت پر مرتا ہوں یہ میری محبوبہ ہے۔ کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں۔" بیک وقت بہت سی آوازیں آئیں۔

"معلوم ہوتا ہے بہت زیادہ پی لی ہے۔" چیف انسپکٹر نے حمید کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔

"جی ہاں، بُری طرح ڈاؤن ہے۔" حمید بولا۔

"مگر فریدی اب تک نہیں آیا۔" چیف نے کہا۔

"معلوم نہیں کیا بات ہے۔" حمید نے کہا۔

"ہاں تو پیارے بھائیو۔" دلاور پھر چیخا۔ "میں جادُوگر ہوں، کالا جادُوگر۔۔۔ میں ایک منٹ میں مُرغی سے انڈا اور انڈے سے مرغی بنا سکتا ہوں۔ خرگوش میں

سے ہیٹ نکال سکتا ہوں۔"

"خرگوش میں سے ہیٹ۔۔۔" ایک آدمی ہنستا ہوا چیخا۔

"خرگوش، ہیٹ میں سے خرگوش۔۔۔!" دلاور چیخا۔ "دیکھئے میرا کمال، یہ دیکھئے یہ ایک انڈا ہے، بتایئے اسے کیا بنادوں۔"

"ہاتھی۔۔۔!" ایک آواز آئی۔

"نہیں۔۔۔ خرگوش۔۔۔!" دوسری آواز سنائی دی۔

"نہیں بھائی اودبلا۔" تیسرا چیخا۔

"اچھا تو میں اسے توڑ کر پیئے لیتا ہوں۔" دلاور نے انڈا توڑ کر حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ "اب یہ تھوڑی دیر کے بعد ہضم ہو جائے گا، کہیے ہے نا کمال۔"

سارا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ "ہاں تو بھائیو۔۔۔!" وہ اسی چبوترے پر بیٹھتے ہوئے بولا جس پر بُت نصب تھا۔ "میں اس عورت پر عاشق ہوں، لیکن یہ بڑی

سنگ دِل ہے۔ میری قطعی پرواہ نہیں کرتی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس کے عشق میں گھُل گھُل کر مر جاؤں گا۔“

اس نے بُت کے پیروں سے لپٹ کر بُلند آواز میں رونا شروع کر دیا۔ سارے لوگ ہنسی کے مارے بے حال ہوئے جارہے تھے۔

”آپ لوگ ہنستے ہیں۔“ وہ رونی آواز میں بولا۔ ”خدا کرے آپ کو بھی کسی سنگ دِل سے عشق ہو جائے۔ میرا دادا اس کے عشق میں مر گیا، میرا باپ اس کے عشق میں مر گیا۔ اور اب میں بھی اس کے عشق میں مر جاؤں گا۔ وہ پھر اس کے پیروں سے لپٹ کر اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔“

دفعتاً ایک کھٹکا ہوا اور وہ بُت کھسک کر ایک طرف ہو گیا جس جگہ وہ نصب تھا۔ وہاں ایک غار پیدا ہو گیا اور دلاور خاں اُسی غار میں گر کر غائب ہو چکا تھا۔ حمید نے سیٹی بجائی۔ سارے جوانوں نے اپنے اپنے پستول نکال لیے۔

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش نہ کرے۔“ ایک سب انسپکٹر چیخا۔

”بینرجی تم پانچ جوانوں کے ساتھ یہیں ٹھہرو۔۔۔!“ چیف انسپکٹر بُت کی طرف بڑھا۔ ”سب دروازے بند کرالو کوئی باہر نہ جانے پائے اور بقیہ لوگ میرے ساتھ آئیں۔“

یہ غار ایک تہہ خانے کا راستہ تھا۔ وہ سب تہہ خانہ میں اُتر گئے۔ تہہ خانہ میں حسب دستور جوا ہو رہا تھا۔ ناجائز شراب، افیون، چانڈو اور کوکین فروخت ہو رہی تھی۔ شہر کی عیاش طبع متمول عورتیں عیش کر رہی تھیں۔ پولیس والے آہستہ آہستہ سارے تہہ خانے میں پھیل گئے۔ دلاور خاں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ سنتوش کو بہت جلد اس کی اطلاع ہو گئی۔ اس نے بھی مورچہ سنبھال لیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک دونوں طرف سے گولیاں چلتی رہیں۔ آہستہ آہستہ سنتوش کی پارٹی سست ہوتی جا رہی تھی۔ اس دوران میں سنتوش بُری طرح زخمی ہو گیا۔ آخر کار فتح پولیس کی ہوئی اور سارے بدمعاش پکڑ لیے گئے۔ لیکن سنتوش غائب تھا۔ اس کی تلاش برابر جاری تھی۔ دفعتاً ایک کمرے سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ حمید کمرے کی طرف لپکا لیکن فوراً ہی وہ باہر نکل آیا۔

”کیا بات ہے۔“ چیف نے پوچھا۔

”سنتوش نے خود کُشی کرلی۔“حمید نے بتایا۔

ڈاکو پولیس کی لاری میں بھر کر کوتوالی کی طرف لے جائے جارہے تھے۔ ایک کار میں حمید، چیف اور بیز.جی بیٹھے تھے۔

” دلاور خاں نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔“ چیف نے کہا۔

”معلوم نہیں اسے زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔“حمید نے کہا۔”میں نے تو اتنا پر اسرار اور بھیانک آدمی آج تک نہیں دیکھا۔“

”خیر وہ اگر یہاں رہ گیا تو بچ کر نہ جاسکے گا۔“چیف نے کہا۔

☆☆☆☆☆

اسی رات کو چیف اور حمید فریدی کی کوٹھی میں بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے۔

”فریدی کا کچھ پتہ نہیں۔“ چیف نے کہا۔

”کہیں وہ دلاور خاں کے پیچھے نہ لگ گئے ہوں۔“حمید نے کہا۔

”کون جانے۔“ چیف بولا۔

”دیکھئے کب واپس ہوتے ہیں۔“حمید نے کہا۔

”آج سے دس سال قبل دلاور خاں کے لیے حکومت نے دس ہزار روپے کا انعام رکھا تھا۔ جو آج بھی بدستور قائم ہے۔ فریدی اسے حاصل کرنے کی ضرور کوشش کرے گا۔“ چیف نے بتایا۔

”جی ہاں ضرور۔۔۔!“ کمرے کے باہر سے آواز آئی اور پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

حمید اور چیف کے سامنے دلاور کھڑا تھا۔

”ہینڈز اپ۔۔۔!“حمید نے پستول نکال کر کہا۔

دلاور خاں ہنسنے لگا۔

”شاباش میرے لال۔۔۔!“ دلاور طنزیہ انداز میں بولا۔ ”سچ پوچھو تو میں تمہاری ہی گولی کا نشانہ بننے کی اُمّید پر اب تک جی رہا ہوں۔“ چیف اور حمید حیرت سے مُنہ کھولے کھڑے تھے۔ ان میں اتنی ہمّت بھی نہ رہ گئی تھی کہ منہ سے آواز تک نکال سکتے۔

”کیوں حمید۔۔۔ میرے احسان کا یہی بدلہ ہے۔“ دلاور مُسکرا کر بولا۔ ”اگر میں آج تمہاری رہنمائی نہ کرتا تو تمہارے فرشتوں کو بھی تہہ خانہ کا راستہ نہ معلوم ہو سکتا۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ اس احسان کے بدلے میں ایک بھیانک خونی کو چھوڑ دیا جائے۔“ چیف نے کہا۔

”اچھا تو لیجئے خادم حاضر ہے۔“ دلاور زمین پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے اپنا منہ گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔

حمید نے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دیں۔ وہ بدستور اسی طرح

بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"آپ یہیں ٹھہریئے میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔" حمید نے کہا۔

"ارے۔۔۔ ارے۔" دلاور خاں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"فریدی۔۔۔!" چیف حیرت سے بولا۔

"ارے آپ۔۔۔!" حمید بھونچکارہ گیا۔

فریدی نے قہقہہ لگایا۔ گھنی مونچھیں اس کے پیروں کے پاس پڑی ہوئی تھیں۔

"بھئی خدا کی قسم کمال کر دیا تم نے۔" چیف نے اس کی پیٹھ ٹھوکتے ہوئے کہا۔

"سب محبّت ہے آپ کی۔"

"تو کیا شروع ہی سے دلاور خاں کا رول ادا کر رہے تھے۔" چیف انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔ اگر یہ نہ کرتا تو اس تہہ خانہ تک رسائی ناممکن تھی۔" فریدی نے

کہا۔

”میں کئی راتوں سے نہیں سو سکا، سخت نیند لگ رہی ہے۔ انشاء اللہ کل ساری داستان سناؤں گا۔“

چیف انسپکٹر تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔

تجوری کا راز

حمید نے دوسرے دِن صُبح ہی صُبح فریدی کے کان کھانے شروع کر دیے۔ وہ سارے واقعات جاننے کے لیے بُری طرح بے تاب تھا۔

”ارے بھئی تم تو جان کو آ گئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”یہ ایک لمبی داستان ہے۔ کہاں تک سناؤں گا۔ بہرحال سنو! مگر یہ بتاؤ پہلے تجوری کا راز بیان کروں یا اس مرتبہ کے طریقہ سُراغ رسانی پر روشنی ڈالوں۔“

”نہیں۔۔۔پہلے میں اس چیز کے متعلّق سنوں گا جس کے بدولت یہ سب کچھ ہوا

ہے۔" حمید نے کہا۔

"اچھا سنو۔۔۔ شاید تم نے نام سنا ہو۔ یہاں ایک بہت بڑے تاجر رام کمار جی تھے میں ان کا نام اتنے ادب سے اس لیے لے رہا ہوں کہ وہ میرے والد صاحب مرحوم کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں اچانک ان کا دیوالہ نکل گیا۔ یہ چیز بڑی حیرت انگیز تھی۔ وہ شخص جس کے ایک اشارے پر لاکھوں کے وارے نیارے ہوتے تھے بظاہر کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا۔ یہ سیٹھ اگروال جو آج سارے شہر کا رئیس التجار بنا بیٹھا ہے ان کے یہاں مقیم تھا۔ ان کے دیوالہ نکالنے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے چپکے ہی چپکے اپنا گھر بھر لیا۔ جس وقت رام کمار جی کا دیوالیہ نکلا ان کے بسر اوقات کے لیے صرف تھوڑی سی جائیداد باقی بچی جو ان کی بیوی کے نام تھی۔ اُس سے اُن کی بسر اوقات ہونے لگی۔ ان کا ایک سالہ بچّہ بھی تھا۔ دیوالہ ہو جانے کے صدمہ کی وجہ سے وہ زیادہ دِن تک زندہ نہ رہ سکے۔ مرتے وقت انہوں نے ایک وصیّت نامہ مرتب کر کے اپنے قانونی مشیر کے یہاں رکھوا دیا اور یہ ہدایت کر دی کہ یہ وصیّت نامہ اس وقت ان

کے بچّے کے حوالے کیا جائے جب وہ بالغ ہو جائے۔ اور اگر وہ مر گیا تو وصیّت نامہ اس کی بیوی کو دیا جائے۔ اگر اس کی حیات بھی وفا نہ کرے تو پھر یہ وصیّت نامہ اس کے بھتیجے سنتوش کے حوالہ کر دیا جائے۔ یہی سنتوش جس نے کل رات خودکشی کی ہے۔ یہ رام کمار جی کا بھتیجا تھا۔ بچپن ہی سے بُری صحبتوں میں پڑ جانے کی وجہ سے وہ بڑا ہو کر اچھا خاصا ڈاکو بن گیا۔

رام کمار جی کے انتقال کے بعد ان کی بیوی اور بچے کی پرورش اسی جائیداد سے ہوتی رہی اور ہاں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ رام کمار جی ایک تعویذ اپنے بچّے کے گلے میں ڈال گئے تھے۔ جس کے متعلّق انہوں نے اپنی بیوی کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اسے اس وقت کھول کر دیکھیں جب بچّہ جوان ہو جائے۔

دو تین سال کے بعد دفعتاً ایک دِن رام کمار جی کے قانونی مشیر نے ان کی بیوی کو اطلاع دی کہ اس کے یہاں چوری ہو گئی۔ چوری ہونے والی چیزوں میں رام کمار جی کا وصیّت نامہ بھی تھا۔ ان کی بیوی کو سخت پریشانی ہوئی۔ وہ وصیّت نامہ ان کے لیے ایک معمّہ سے کم نہ تھا۔ کیونکہ بظاہر رام کمار جی کے پاس کوئی ایسی چیز باقی نہ

تھی جس کے لیے وہ کوئی وصیّت نامہ مرتب کرتے۔ جائیداد خود ان کے نام تھی۔ اس لیے اس کے سلسلہ میں کسی قسم کی وصیّت کا سوال ہی نہیں رہ جاتا تھا۔ اس اُلجھن کے تحت انہوں نے بچّے کے گلے میں پڑا ہوا پُراسرار تعویذ قبل از وقت ہی کھول ڈالا۔ اس تعویذ کے ذریعہ انہیں پتہ چلا کہ وصیّت نامہ کو پڑھے بغیر خزانہ کا پتہ چلنا دشوار تھا۔ انہیں ایک گونہ اطمینان ہو گیا کہ بغیر اس کے وصیّت نامے کا چرانے والا اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ انہوں نے تعویذ بچّے کے گلے میں کھول کر احتیاط سے رکھ دیا۔ چار ماہ قبل کی بات ہے کہ اچانک ایک دِن کسی نے ان کے بکس کا تالا توڑ کر تعویذ نکال لیا۔ ان کی پریشانیوں کی حد نہ رہی۔ وہ مجھے جانتی تھیں۔ ایک دِن انہوں نے مجھے بُلوا بھیجا۔ اور سارا واقعہ بتا کر طالبِ امداد ہوئیں۔ رام کمار جی کی ساری شفقتیں یاد آ گئیں۔ وہ مجھے بھی اپنے بچّے ہی کی طرح پیار کرتے تھے۔ میں نے ان کی بیوی سے وعدہ کیا میں حتیٰ الامکان کوشش کروں گا اور اسی دِن سے میں نے تحقیقات شروع کر دیں۔ کئی دِنوں کے بعد پتہ چلا کہ وصیّت نامہ سیٹھ اگروال نے رام کمار جی کے قانونی مشیر

کے یہاں سے چوری کروایا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر باضابطہ کارروائی کر کے اُسے حاصل کرنے کی کوشش کی تو کامیاب نہ ہو سکوں گا اس لیے میں نے وہ طریقہ کار اختیار کیا۔ چونکہ چیز چوری کی تھی اس لیے سیٹھ اگروال نے بھی پولیس کو بیان دیا کہ اس کی کوئی چیز چوری نہیں کی گئی ہے۔

اس کے بعد سے مجھے اس چیز کی بہت زیادہ تشویش ہو گئی تھی کہ آخر اس پر گولی کس نے چلائی۔ اس دوران میں جب میں جگدیش کو بے وقوف بنانے کے لیے کار سے اُتر گیا تھا مجھے چند نامعلوم لوگوں سے دو دو ہاتھ کرنے پڑے۔ میں نے انہیں اور پولیس کو لڑنے میں اُلجھا دیا اور خود پولیس کی لاری لے کر فرار ہو گیا۔ مجھے لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کام کرنے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر اس چیز کے پتہ لگانے کی تھی کہ آخر سیٹھ اگروال کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے جو اس وصیّت نامہ میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کا احساس ہونے لگا کہ یہ سنتوش کی حرکت ہے اور اسی نے وہ تعویذ بھی چرایا ہے۔ لیکن وصیّت نامہ ہاتھ نہ لگنے کی وجہ سے بالکل بے بس ہے چونکہ اس

سے چیز کو اُگلوانا تھا۔ اس لیے میں نے دلاور خاں کا بھیس بدلا اور سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ وصیّت نامہ اپنی تجوری سے نکال لے گیا۔ اس دِن مجھے تم پر بہت ہنسی آئی تھی جب تم بر آمدے میں پھیلے ہوئے پٹاخوں پر اُچھل کود رہے تھے۔ وہ میں نے دراصل اس لیے ڈالے تھے کہ جس وقت میں وصیّت نامہ نکالنے میں مشغول ہوں تو مجھے آنے جانے والوں کی آہٹ مل سکے۔ سب سے پہلے تم ہی ان پٹاخوں کا شکار ہوئے۔

بعد کے واقعات سے تو تم واقف ہی ہو۔ ایک دِن میں نے سنتوش کو بلا کر وہ تعویذ دیکھ ہی لیا۔ اس کا نقشہ میرے ذہن میں موجود تھا۔ اس کے مطابق وہ خزانہ اسی مکان میں ایک جگہ دفن ہے جہاں رام کمار جی کی بیوی رہتی ہے۔ اب ذرا تھکن دور ہو جائے تو میں جا کر وہ خزانہ کھدوانے میں ان کی مدد کروں گا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں نے وہ وصیّت نامہ چرا کر اگر اس کے حقداروں کے پاس پہنچا دیا تو کون سا جرم کیا۔ اگر یہ جرم ہے بھی تو میں اسے جائز سمجھتا ہوں۔"

"اچھا یہ تو بتایئے فریدی صاحب کہ آپ اتنے طاقتور کب سے ہو گئے ہیں۔" حمید

بولا۔

"ارے میاں اسے پوچھ کر کیا کرو گے۔ یہ سب راز کی باتیں ہیں۔ ایک اچھے سُراغ رساں میں یہ ساری خصوصیات ہونی چاہئیں۔"

"سنتوش نے تو خودکُشی کرلی۔ اب اس کیس میں کیا ہو گا۔" حمید نے دریافت کیا۔

"کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن میرے پاس اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ سیٹھ اگروال پر سنتوش ہی نے گولی چلائی تھی اور اب سے تین سال قبل اس نے ایک خون بھی کیا تھا۔" فریدی نے انکشاف کیا۔

"اچھا تو کیا آپ اس وصیّت نامہ کا بھی تذکرہ کریں گے۔"

"کیا احمقوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اب جبکہ سنتوش مر چکا ہے اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ سیٹھ اگروال میں اتنی ہمّت نہیں کہ اب وہ اس کیس پر از سرِ نَو روشنی ڈالے کیونکہ اس نے وصیّت نامہ قطعی غیر قانونی طور پر حاصل کیا تھا۔ لہٰذا اب اس کی طرف سے کوئی کھٹکا نہیں رہ جاتا۔۔۔ اچھا بھئی اب بس۔۔۔! کیا

اب تک چائے نہیں بنی۔۔۔؟"

تمام شد